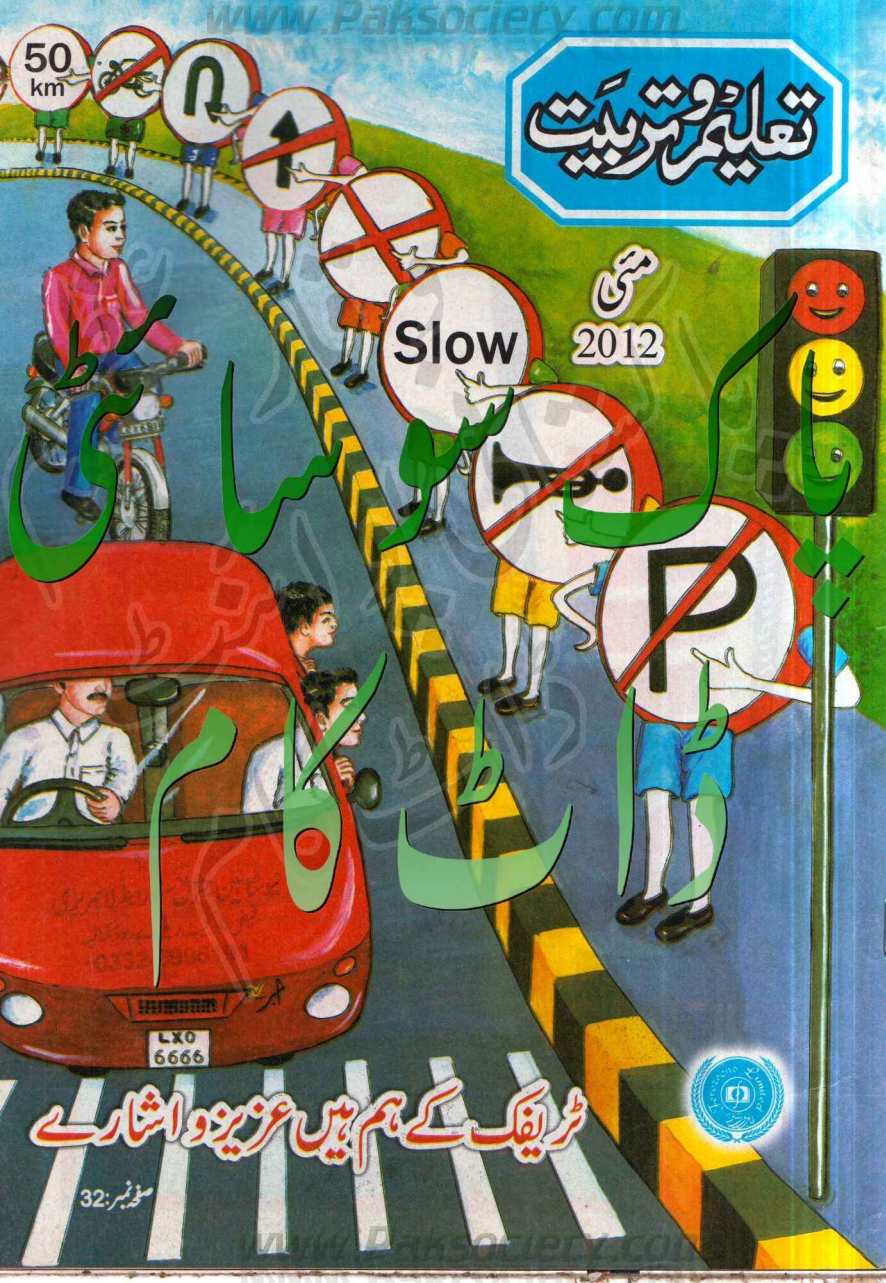


تعلیم و تربیت

مئی
2012



ٹریفک کے ہم ہیں عزیزو اشارے

صفحہ نمبر: 32



تعلیم و تربیت

بچوں کا
محبوب رسالہ

رکن آل پاکستان نوز مجوزہ سوسائٹی

72 ویں سال پہلا شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

اس شمارے میں

مئی 2012ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

مصور تصویر بنانے میں مصروف تھا جب کہ اس کا کم سن بیٹا اس کے پاس بیٹھا مسلسل اُسے دیکھ رہا تھا۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو اُس کے بیٹے نے پوچھا۔

”ابا جان! یہ تصویر آپ کیسے بنا لیتے ہیں؟“

مصور نے جواب دیا: ”میتنا! تصویر تو رنگوں میں موجود ہوتی ہے، میں تو بس برش کیوں پر پھیرتا ہوں تو تصویر خود بخود رنگوں سے نکل آتی ہے۔“

”ابا جان! کیا میں بھی رنگوں سے ایسی تصویر نکال سکتا ہوں؟“

”ہاں، تم بھی ایسا کر سکتے ہو، مگر اس کے لیے تمہیں یہ فن سیکھنا ہوگا، جب تم یہ فن سیکھ کر مسلسل مشق کرو گے تو رنگوں میں سے تصویر خود بخود نکل آئے گی۔“

فنون لطیفہ کی ہر شاخ میں سیکھنے اور مسلسل مشق کرنے ہی سے فن کار کے فن میں نکھار اور چنگی آتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ تحقیقی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے، مگر اس صلاحیت کو نکھارنے کے لیے ہر حال ایک استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب اچھا استاد مل جائے تو آغاز ہی میں نو آموز فن کار کا فن نکھر جاتا ہے۔ آپ میں سے بیشتر نئے لکھنے والوں کو ہم سے شکایت ہوتی ہے کہ ہم اُن کی تحریروں شائع نہیں کرتے، ان دوستوں سے گزارش ہے کہ مسلسل مشق جاری رکھیں، کسی اچھے استاد سے اصلاح لیں، خوب مطالعہ کریں، اگر آپ ایسا کریں گے تو بہت جلد آپ کی تحریر میں نکھار پیدا ہو جائے گا۔ اُمید ہے آپ ضرور ان باتوں پر عمل کریں گے۔

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آپ کے محبوب رسالے ”تعلیم و تربیت“ نے اپنی اشاعت کے 71 سال مکمل کر لیے ہیں۔ اس وقت جو شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ 72 ویں سال کا پہلا شمارہ ہے۔ ”تعلیم و تربیت“ پاکستان میں بچوں کا واحد رسالہ ہے جو 72 سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ”تعلیم و تربیت“ کے 71 سال پورے ہونے پر ہماری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجئے۔ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔
فی امان اللہ (ایڈیٹر)

1	اداریہ
2	دوسرا قرآن وحدیث
3	مہنگ
7	مختصر نگاری
12	نیچے سلطان
15	ادب و ادب
16	ادب و ادب
19	تجربہ نگاری
20	کشف فیاضی
24	دوڑی ملی آزمائش
25	سازہ خوار
28	کرامت بخاری
29	چھوٹا کامیاز سببوں۔۔۔
32	ثریث کے اشارے
34	بارون اشرف
36	میری زندگی کے مقاصد پر غور کریں
37	بچوں کا انکسائڈ پیڈیا
40	سفرے لوگ
42	آئیے عبد کریں
43	کمال اور کھلاڑی
48	آپ بھی لکھتے
51	جینا کی چائی
55	آپ کا خط ملا
57	افوکی دنیا
60	آنسو
64	جواہر مصور

اور بہت سے دل چاہنے والے اور سلسلے
سرورق، ثریث کے اشارے

سر کو لیٹن اسٹنٹ

مشیر

اسٹنٹ ایڈیٹر

ایڈیٹر، جیالٹر

چیف ایڈیٹر

محمد بشیر رائی

سعید لخت

نذیر انبالوی

ظہیر اسلام

عبد السلام

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایکریس روڈ، لاہور۔
N: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail: tot.tarbiats@gmail.com
tot tarbiats@live.com

سالانہ خریدار بچنے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت چنگی بنگ ڈرائٹ یا مئی آزوری کی صورت
میں سر کو لیٹن میٹر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایکریس روڈ، لاہور کے چھ پر سال فرمائیں۔
فون: 6278816 36361309-36361310 فکس: 6278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
ایشیا، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔
امریکا، کیلیڈ، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ:
25 روپے

www.Paksociety.com

رفیق احمد چوہدری

درس قرآن و حدیث

آداب مسجد



”اے اللہ میرے لیے رحمت کے دروازے کھول دے۔“
مسجد میں داخل ہو کر جہاں جگہ ملے بیٹھ جانا چاہیے لوگوں کی گردنوں کو پھلانگنا نہیں چاہیے۔ حدیث نبوی ﷺ کے مطابق ایسا کرنے والے کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس نے جہنم کی طرف قدم بڑھایا۔ نمازیوں کے آگے سے بھی نہیں گزرنا چاہیے اگر اگلی صفوں میں جگہ ہو تو خلا کو مکمل کرنے کے لیے آرام سے آگے چلے جانا چاہیے۔ آداب مسجد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (تہنہ مسجد) نماز پڑھ کر بیٹھنا چاہیے۔

مسجد میں اونچی آواز سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے نہ ہی خرید و فروخت کرنی چاہیے، نہ گشودہ چیز کا اعلان کرنا چاہیے اور نہ ہی دنیاوی باتیں کرنی چاہئیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے منع فرمایا مسجد میں خرید و فروخت سے، گشودہ چیز کا اعلان کرنے سے اور جمعہ کے روز نماز سے پہلے حلقہ بنانے سے۔ (جامع الترمذی) یہ تمام امور آداب مسجد کے منافی ہیں۔

مسجد میں صرف ذکر و اذکار اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیے۔ جب کہ مومن کی شان بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا۔ مومن مسجد کے اندر ایسے ہوتا ہے جیسے پانی کے اندر مچھلی یعنی اگر مچھلی کو پانی سے نکال دیا جائے تو وہ پانی میں جانے کے لیے بے تاب رہتی ہے یا پھر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ مسجد سے نکلے ہوئے پہلے بایاں پاؤں باہر نکالیں اور یہ دعائیں پڑھیں۔

”اے اللہ میں تجھ سے تیرے فضل کا سوال کرتا ہوں۔“

پیارے بچو! آئیے ہم سب عہد کریں کہ مسجد کے آداب کا خیال رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

زمین پر سب سے اچھی جگہ مسجد یعنی اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، جہاں ہم اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ مسجد تعمیر کرنا اور اس کی صفائی کرنا بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔
”مسجد کی تعمیر تو وہی کرتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ (سورۃ التوبہ آیت: 18)

حضرت عثمان غنیؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مسجد کی تعمیر کی اللہ تعالیٰ اس کی مثل اُسے جنت میں گھر بنا دے گا۔“ (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے مسجد بنانے اور اُسے صاف ستھرا اور خوش بودار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے مسجد کی شان کو بہت اونچا رکھا ہے تاکہ وہاں دین کی تبلیغ اور دعوت الی اللہ کا اہتمام کیا جا سکے اور مسلمانوں کی تربیت کی جا سکے۔ نماز کے ساتھ ساتھ وہاں تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی جاری کیا جائے۔ دین کے دفاع کا کام اور مسلمانوں کے آپس کے فیصلے بھی مسجد میں ہوں۔ باہمی مشاورت ہو۔ گویا مسجد کو بیک وقت پارلیمنٹ ہاؤس، سپریم کورٹ اور دفاعی ہیڈ کوارٹر کا مرتبہ حاصل ہو ان تمام باتوں کے پیش نظر آپ ﷺ نے مسجد میں داخل ہونے، بیٹھنے، نماز پڑھنے اور مسجد سے نکلنے کے آداب بیان کیے ہیں۔

مسجد میں داخل ہونے والے شخص کو پاک صاف ہونا چاہیے اُسے خوش بو استعمال کرنی چاہیے۔ خصوصاً جمعہ کے روز اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

”مکہ کی تمام عبادت گاہوں کے پاس تم زینت اختیار کرو۔“

(سورۃ الاعراف، آیت: 3)

مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے اندر رکھنا چاہیے اور یہ دعا پڑھنی چاہیے۔



سب ہی منور کے اخلاق اور کام سے خوش تھے۔ بس ایک آدمی تھا جو منور کے کام سے جلتا تھا۔ اس کا نام حنیف تھا۔ منور کو دیکھ کر اُس نے بھی حلوہ بنانے کا کام شروع کیا تھا۔ اُس کے پاس اپنی دکان نہیں تھی۔ اس لیے اُس نے ریڑھی پر حلوے کا تھال لگا لیا تھا۔ وہ منور کی دکان سے قدرے بہتر کر ریڑھی لگاتا تھا۔ منور تو دس بجے تک اپنے کام سے فارغ ہو جاتا تھا لیکن حنیف وہ پہر تک گاؤں کے انتظار میں کھڑا رہتا تھا۔ منور کا حلوہ جب فروخت ہو جاتا تھا۔ تب حنیف کی باری آتی تھی، لیکن دس بجے کے بعد ناشتہ کرنے والوں کی تعداد کم ہی ہوتی ہے۔ یوں حنیف کو نفع کی بجائے نقصان ہو رہا تھا۔ وہ اپنے حلوے کا معیار بہتر بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے حلوے میں بادام ڈالتا تو کبھی چاندی کے ورق لگاتا اور کبھی اُبلے اندے کاٹ کر حلوے کو سجاتا تھا، لیکن بات نہیں بنتی تھی۔ کہیں تو کوئی کمی تھی۔ وہ کی کیا تھی یہ ایک سوالیہ نشان تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ آج منور کا حلوہ نو بجے ہی فروخت ہو گیا تھا۔ اور اب وہ گرم پانی سے برتن صاف کر رہا تھا کہ ایک لڑکا دکان میں داخل ہوا۔
”حلوہ ختم ہو گیا ہے بیٹا!“ منور کی آواز میں حلوے جیسی مٹھاس تھی۔

منور کا دیسی گھی کا حلوہ پورے شہر میں مشہور تھا۔ لوگوں کی اکثریت منور کے پاس جا کر نان حلوے کا ناشتہ کرنا پسند کرتی تھی۔ ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جو ناشتہ گھر لے جاتے تھے۔ گرم چائے کے ساتھ اس ناشتے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ منور کا یہ معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز سے ایک گھنٹہ پہلے جا گاتا تھا۔ اور کڑا ہی آگ پر رکھ دیتا تھا۔ گھی میں سوچی بھون کر وہ خالص کھوئے کی مدد سے حلوہ تیار کرتا اور پھر دیسی گھی کا تڑکا لگا دیتا۔ اسے میں نماز کا وقت ہو جاتا تھا۔ منور نماز سے فارغ ہو کر اپنی دکان کھول لیتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک حلوائی کی دکان تھی۔ منور کا بڑا بھائی حلوائی تھا۔ منور نے حلوہ بنانے کا ہنر اپنے بھائی سے سیکھا تھا۔ نیت اچھی تھی تو کام بھی چل پڑا۔ پھر وہ وقت آیا کہ دکان کھولنے سے پہلے ہی گاؤں کا ہجوم دکان کے سامنے موجود ہوتا۔ دیکھا دیکھی چند دوسرے حلوائیوں نے بھی حلوہ بنانے کی کوشش کی لیکن سب ناکام ہو گئے۔ منور کے حلوے کی خاص بات اس کی مہک تھی۔ یہ مہک الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ایک جادو تھا۔ جو ایک بار حلوہ کھا لیتا تھا۔ وہ اس جادو کا اسیر ہو جاتا تھا۔ منور روزانہ تقریباً دو من حلوہ تیار کرتا تھا۔ صبح نو سے دس بجے کے درمیان سارا حلوہ فروخت ہو جاتا تھا۔ پھر منور تو اپنے گھر آرام کی غرض سے چلا جاتا تھا اور اُس کا بھائی دکان سنبھال لیتا تھا۔

متاثر ہو گیا۔ ایسے میں ایک آواز اُن کے کانوں سے نکرائی۔

”منور بھائی! کیا حلوہ ختم ہو گیا ہے؟“

”جی ہاں..... آپ یوں کیجئے۔ حنیف سے لے لیجئے.....“

منور فوراً بولا۔

”ہاں تو بیٹا..... تمہارا نام کیا ہے؟“

”میں آصف ہوں..... میں گاؤں سے آیا ہوں.....“ آصف

نے منور کو اپنے گاؤں کا نام بتایا۔

”لیکن بچے اس وقت تو ہمارے پاس کوئی کام ایسا نہیں ہے

جو تم کر سکو.....“ منور کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آصف بول

پڑا۔ بے چینی اُس کے لہجے سے پک رہی تھی۔

”میں حلوہ بنانے میں آپ کی مدد کروں گا۔ میں برتن دھو

دوں گا۔ میں دکان کی صفائی کروں گا۔ اور..... اور.....“ کچھ کہتے

کہتے آصف رُک گیا۔

”اور کیا؟“ منور غور سے آصف کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”اور ایک مقصد..... میں ایک مقصد کے تحت آپ کے پاس

آیا ہوں۔ جو میں ابھی آپ کو نہیں بتا سکتا، لیکن جلد ہی بتاؤں گا،

آپ بس مجھے اپنے پاس رکھ

لیں.....“ آصف کا سر جھکا ہوا

تھا۔ جب کہ منور آصف کی

باتوں میں الجھ گیا تھا۔ اتنا تو منور

سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا صاف گو ہے،

سچا ہے۔ اگر خاموش ہے تو کچھ

مصلحت ہے۔ منور نے فیصلہ کر لیا

کہ وہ آصف کو اپنے پاس رکھے

گا۔ اور اُس وقت کا انتظار کرے گا

جب آصف خود اسے اپنی آمد کے

مقصد سے آگاہ کرے گا۔ پھر منور

نے آصف کو اپنے پاس رکھ لیا۔

بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منور نے

آصف کو پناہ دے دی تھی۔

منور کے پاس آصف کو کام کرتے

”مجھے حلوہ نہیں چاہیے.....“ اس لڑکے کا لہجہ عجیب سا تھا۔

منور کا ہاتھ رُک گیا۔

”تو پھر میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ آواز میں مٹھاس

برقرار تھی۔

”مجھے کام چاہیے..... میں آپ کے پاس کام کرنا چاہتا

ہوں.....“

لڑکے کی آواز میں سنجیدگی تھی اب منور نے اُس لڑکے کی طرف

دیکھا۔ اُس لڑکے کی عمر بارہ سال کے قریب تھی۔ چہرے پر غربت

کے آثار تھے۔ اس کے کپڑے شکن آلودہ اور ہاتھ کالے تھے۔

”تمہارے ہاتھ کیوں کالے ہیں؟“ منور نے پوچھا۔

”کل تک میں ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ ورکشاپ میں

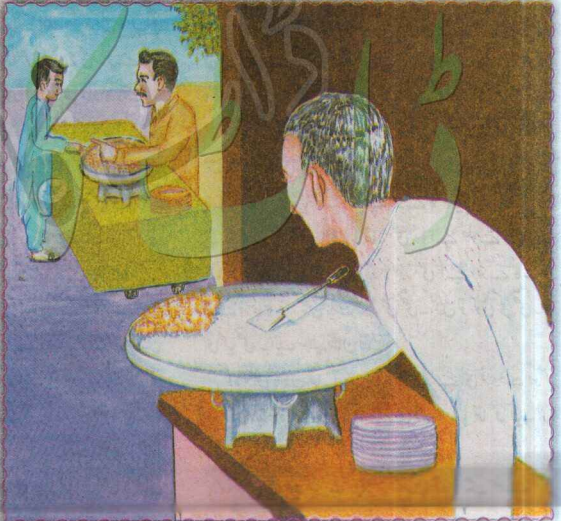
گاڑیوں کے انجن، گرہیں اور آئسل سے ہاتھ کالے ہی ہوں گے

نا..... میری ماں میرے کالے ہاتھ دیکھ کر روز رات کو روتی ہے۔

میں اپنی ماں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ آپ مجھے اپنی

دکان پر رکھ لیجئے۔ میں سارے کام کروں گا۔ اور ہمیشہ آپ کا

فرماں بردار رہوں گا.....“ اُس لڑکے کی آواز میں سچائی تھی۔ منور



پاس موجود تھا اور پھر آصف کے ہونٹ تھر تھرائے۔

”جی ہاں..... حنیف میرے ماموں ہیں..... اور.....

آج..... آج یہ تھپڑ جو مجھے لگا ہے تو یہ تھپڑ وہ راز بتانے کا

الغام ہے جو راز میرے ماموں سمجھتا ہی نہیں چاہتے۔ میں

پہلے دن جس راز سے آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ راز میرے

ماموں پانچ سال گزر جانے کے باوجود سمجھنے کے لیے تیار

نہیں، دو ہفتے پہلے میرے ماموں ہمارے گھر آئے

تھے۔ میری امی کو ان کی آمد اچھی نہیں لگی تھی، لیکن جس

مقصد کے لیے یہ آئے تھے۔ اُس کے متعلق سن کر میری

امی خوش ہو گئی۔ پل بھر میں اُن کے تمام گلے شکوے دُور

ہو گئے تھے۔ ماموں مجھے لینے آئے تھے۔ اس سے زیادہ

اچھی بات اور بھلا کیا ہو سکتی تھی۔ اتنے عرصے کے بعد

انہیں اپنی بہن کا خیال آیا تھا۔ اور وہ خوشی سے جھوم اٹھی

تھیں۔ میرے ابو مزدوری کرتے تھے۔ تین سال پہلے شہر میں ایک

عمارت کی تعمیر کے دوران وہ عمارت کی پانچویں منزل سے گر کر

جاں بحق ہو گئے تھے۔ اُس وقت میں سکول میں پڑھتا تھا۔ ابو کی

وفات کے ساتھ ہی تعلیم سے میری دوتی بھی ٹوٹ گئی۔ اب میری

امی لوگوں کے گھر میں مل کام کرتی تھی۔ امی اگر چاہتی تو میری

تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ سرکاری سکول میں تعلیم پر صرف

ہونے والے اخراجات معمولی تھے، لیکن امی کی نظر آنے والے وقت

پر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں جلد سے جلد کوئی بہتر سیکھ لوں اور روزی

کمانے کے قابل ہو جاؤں۔ پھر میں ایک ورکشاپ میں کام کرنے

لگا۔ جب میں رات کو اپنے گھر واپس لوٹتا تو میرے کالے ہاتھ دیکھ

کر امی کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ ایسے حالات میں ماموں

آگے نہ بڑھتے۔ امی نے اسے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں

آصف کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اور بہت جلد اسے حلوہ بنانے کا

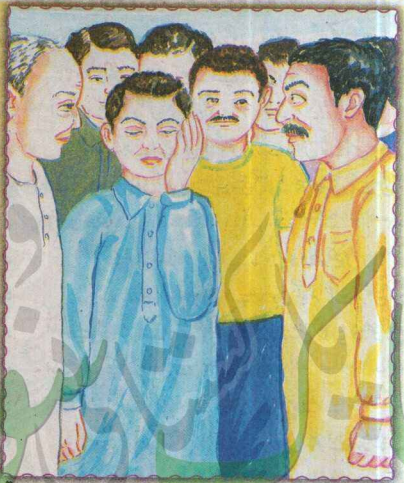
طریقہ سکھا دوں گا۔ میری امی فوراً ہی رضا مند ہو گئیں اور گھر سے

رخصت کرتے وقت امی نے مجھے صرف ایک ہدایت کی.....

”میرے بیٹے اپنے ماموں کی ہر بات پر عمل کرنا“ یہ کہتے

کہتے آصف کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”میں ماموں کے ساتھ یہاں آ گیا۔ میری زندگی میں یہ ایک



تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ آصف خوب دل لگا کر کام کر رہا تھا۔

اب اُس کے ہاتھ کالے نہیں رہے تھے۔ اس دوران منور نے ایک

بات محسوس کی تھی۔ وقتاً فوقتاً آصف حنیف کے پاس جاتا تھا اور

ایک دو منٹ بات چیت کر کے واپس لوٹ آتا تھا۔ یہ بات منور

کے دل میں شک کا بیج بو رہی تھی۔ ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ اب

صبر کرنا منور کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اور پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔

ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا تھا۔ اور اُس نے منور کو خبر دی کہ حنیف نے

آصف کو تھپڑ مارا ہے۔ منور نے آصف کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔

اب رُکنا مشکل تھا۔ منور دوڑ کر حنیف کی ریڑھی کے پاس پہنچا۔

وہاں پہلے ہی بہت سے لوگ جمع تھے۔ منور راستہ بناتے ہوئے

آگے بڑھا اور پھر اُس نے دیکھا۔ آصف کا ایک ہاتھ اپنے رخسار

پر تھا۔ جب کہ حنیف کے چہرے پر پشیمانی کے آثار تھے۔

”کیا ہوا ہے؟“ منور نے پوچھا۔ درحقیقت وہ پوچھنا یہ چاہتا

تھا کہ کیوں ہوا۔ دونوں سوال ایک دوسرے کے ساتھ جڑے

ہوئے تھے۔ پھر ایک انکشاف نے منور کو ہلا کر رکھ دیا۔ منور کیا

وہاں موجود تمام لوگ جو منور اور حنیف کو جانتے تھے۔ سب ہل کر رہ

گئے تھے۔ یہ کیسی ترکیب تھی۔ یہ کیسی تدبیر تھی۔ اور اب سب کی

نظریں آصف پر جمی ہوئی تھیں۔ سب سوالوں کا جواب آصف کے

برکت بھی نہیں ہے.....“ آصف کی بات مکمل ہو گئی تھی۔ ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ اور پھر آصف اپنے گاؤں واپس لوٹ گیا۔ کسی نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

آصف جب اپنے گھر پہنچا تو وہ بہت اداس تھا۔ اُس کی اس بے وقت آمد پر ای بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ پھر ساری بات سن کر انہوں نے کہا۔

”تم نے ایک غلط کام میں اپنے ماموں کا ساتھ کیوں دیا؟“
 ”آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اپنے ماموں کی ہر بات پر عمل کرنا اور ویسے بھی میں نے ماموں منور کو اشارے میں بتا دیا تھا کہ میں ایک مقصد کے تحت اُن کے پاس آیا ہوں.....“

”اب تم نے کیا سوچا ہے؟“ ای نے پوچھا۔
 ”سوچنا کیا ہے۔ کل چھٹی ہے۔ پرسوں پھر سے ورکشاپ جاؤں گا۔ وہی کام وہی کالے ہاتھ۔“ آصف کی بات ماں کے دل کو ترپا گئی۔

اگلے دن آصف اپنے کمرے میں موجود تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ امی نے دروازہ کھولا اور پھر آصف کے کانوں سے ایک آواز گزرائی۔

”میں آصف کو لینے آیا ہوں.....“ آصف یہ آواز اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ لپک کر کمرے سے باہر نکلا اُس کا ماموں اُسے لینے آیا تھا۔
 ”کیا آپ اُسے حلوہ بنانے کی تربیت دیں گے؟“ امی پوچھ رہی تھیں۔

”جی نہیں..... پہلے تعلیم..... دوسرا مرحلہ تربیت کا ہے.....“
 اتنی دیر میں آصف، ماموں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

”چلو میرے بچے تمہاری جگہ کہیں اور ہے.....“ ماموں نے آصف کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ امی یہ منظر پُریم آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے آج محسوس کیا تھا کہ کبھی کبھی محبت کے رشتے خون کے رشتوں پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں۔ جی ہاں آصف کا ماموں کوئی اور نہیں منور تھا۔ وہی منور جس کا دیسی گھی کا حلوہ پورے شہر میں مشہور تھا۔ اور آج اُس کے حلوے کی مہک نے رشتوں کو بھی مہکا دیا تھا۔

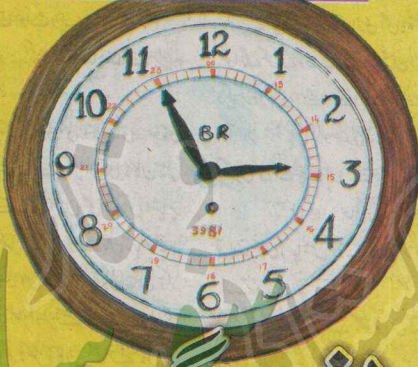
تبدیلی کا آغاز تھا، لیکن یہ وہ تبدیلی نہیں تھی جس کے تحت میں یہاں آیا تھا۔ بات کچھ اور ہی تھی اور پھر اس رات مجھے اُس بات سے آگاہ کر دیا گیا۔ مجھے یہاں ہنسیکھنے کے لیے نہیں لایا گیا تھا۔ بلکہ اُس مجید کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا جو منور کے پاس تھا حنیف کے پاس نہیں، گزشتہ پانچ سال سے ماموں حنیف، منور کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ناکام ہیں مجھے یہ جانتا تھا کہ منور اپنا حلوہ کیسے تیار کرتا ہے۔ وہ کیا ترکیب ہے جس کی مدد سے منور کا حلوہ ایسا بن جاتا ہے کہ کوئی اور حلوائی اس کا مقابلہ نہیں کر پاتا۔ اور پھر میں نے وہ مجید پایا۔ میں جان گیا کہ وہ راز کیا ہے۔ میں نے اپنا مقصد پایا اور اب جب میں ماموں کو وہ راز بتاتا ہوں تو یہ ناراض ہوتے ہیں۔ میری بات کا یقین نہیں کرتے۔ اب میں واپس چلا جاؤں گا۔ میرا یہاں پر کام ختم ہو چکا ہے.....“ آصف نے بات ختم کی تو منور چونک پڑا۔

”وہ راز کیا تھا؟“ منور کے دل کا عالم بہت عجیب سا تھا۔ ساری بات سن کر بھی وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اور اب وہ آصف سے اُس راز کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ جو اُس سے متعلق ہی تھا۔ اور وہ خود ہی یہ راز نہیں جانتا تھا۔ اس دل چسپ سوال پر آصف مسکرنے لگا۔ پھر وہ بڑی بنجیدگی سے بولا۔

”حنیف میرا ماموں ہے تو آپ بھی میرے ماموں جیسے ہی ہیں۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں، ورکشاپ میں میرے بزرگ استاد نے اپنے دوستوں سے ایک بات کہی تھی۔ وہ بات میں سن رہا تھا۔ آپ میں وہ بات ہے۔ میرے استاد نے کہا تھا کہ جس چھت میں نکاسی آب کا راستہ نہیں ہوتا وہ چھت گر جاتی ہے۔ آپ وہ چھت ہیں جس میں نکاسی آب کا راستہ ہے، میں نے دیکھا ہے کہ آپ کی دکان سے کوئی بھکاری، کوئی سوالی مایوس نہیں لوٹتا۔ آپ سوالی کا چہرہ دیکھ کر اسے مفت ہی نان پر حلوہ رکھ کر دے دیتے ہیں آپ کو اللہ روزی کیسے نہیں دے گا.....“ آصف سسک پڑا۔ منور کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

”جو اللہ کی مخلوق کو نوازتا ہے۔ اللہ بھی تو اُسے نوازتا ہے.....“
 میرے ماموں میں یہ خوبی نہیں ہے۔ اس لیے ان کے رزق میں

ایک گھڑی کی کہانی جس پر بہت عرصہ کے بعد ابھی گھڑی آئی تھی



منحوس گھڑی

محمد فاروق دانش

آج بیٹھے
بیٹھے اُس کے دل
میں دُکان کی صفائی
کا خیال آ گیا تھا۔
وہ دُکان کی اشیا کو
کپڑے سے صاف
کر کے واپس اُن
کی جگہ پر لگا رہا
تھا۔ جب وہ تمام
سامان کو صاف کر
چکا تو اسے خیال آیا
کہ بہت سارا مال
اس کے اندرونی
اسٹور میں بھی موجود
ہے۔ آج کل کام

ایک آنکھ نہیں بھا
رہی تھی اس لیے
اس نے اسے کچھ
سوچتے ہوئے
اسٹور میں بٹخ دیا
تھا۔ یہ قدیم زمانے
کی ایک گھڑی تھی۔
اس قسم کے بڑے
بڑے وال کلاک
آپ نے اکثر
ریلوے اسٹیشنوں
پر لگے دیکھے ہوں
گے۔
آج کے دور کے
جدید اور خوب

صورت ترین کلاک دیکھنے والے افراد کی نظر میں بھلا ایسے پرانے
کلاک کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ یہی حال نجف کا تھا۔ اس وقت
بہر حال وہ گھڑی کی اُن جانے سے انداز میں صفائی کر رہا تھا، مشین
کو تیل دینے کے بعد اس نے چابی بھرنا شروع کی۔ جب چابی مکمل
ہوئی تو اس نے وقت درست کر کے اسے اٹھا کر سامنے موجود ایک
کیل پر ٹانگ دیا۔

اس کام سے فراغت کے بعد اس نے دوسرے کاموں
کی جانب توجہ دینے کی کوشش کی، لیکن نہ جانے اس گھڑی میں ایسی
کیا کش تھی کہ ایک لمحے نظر ادھر ادھر کرنے کے بعد دوبارہ وہ
اسی طرف دیکھنے لگتا۔ کچھ دیر وہ اسے ٹھنکایا باندھے دیکھتا رہا۔
اچانک ہی اس کے ذہن پر اس گھڑی سے متعلق پرانے واقعات
منعکس ہونے لگے۔

☆☆☆

”ہیلو....! ہاں ابھی اس گھڑی کا کیا لو گے؟“ اس کے
والد نے کباڑیئے سے سوال کیا۔

کاج ویسے ہی مندا چل رہا تھا اس لیے وہ اپنے آپ کو مصروف
رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے اسٹور کھولا اور اس کی صفائی میں لگ گیا۔ بہت
سی اشیا تو بے کاری تھیں۔ اس نے انھیں ایک فالٹو تھیلے میں ڈالنا
شروع کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان اشیا کو کسی کباڑیئے کے
حوالے کر دے گا، یوں جگہ بھی خالی ہو جائے گی اور کچھ رقم بھی مل
جائے گی۔ دو چار اشیا کام کی نکلیں تو اس نے انھیں دُکان میں ایک
کونے میں رکھ دیا۔ آخر میں اس کے ہاتھ ایک بڑا سا قدیمی وال
کلاک لگا۔ اسے اس نے اٹھایا ایک لمحہ کچھ سوچا۔ پھر اسے باہر لا کر
اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس کو غور سے دیکھتے ہوئے صاف کرنے لگا۔

اس پر خاصی گرد جمی تھی۔ اس نے اسے اچھے طریقے
سے صاف کیا۔ اندرونی حصہ کھول کر اس کا ڈائل بھی چکانے لگا
تاکہ نمبر واضح نظر آنے لگیں۔ اس نے مشینی تیل کی شیشی اٹھا کر
بچھلی جانب موجود چابیوں کی گراریوں میں تیل ڈالنا شروع کیا۔
کافی عرصے پہلے اسے اس گھڑی سے خاصی چڑ ہو گئی تھی۔ اسے یہ

چکر لگاتا تھا تاکہ کوئی کام کی چیز مل جائے تو اس کے اچھے دام کھرے کیے جاسکیں۔ کباڑی بھی اچھی حالت میں ملنے والی چیزوں کو الگ کر کے رکھ لیتے تھے۔ انھیں اندازہ تھا کہ محیب صاحب مال دیکھ کر دام بھی اچھے دے دیتے ہیں۔

”ہاں بولو جلدی۔۔۔“ انھوں نے سودا بنانے کے لیے گھڑی کو الٹ کر دیکھتے ہوئے کباڑی سے پوچھا۔
”کیا کہوں بھائی؟ آپ خود ہی فیصلہ کر لیں۔ میں جھوٹ تو بولتا نہیں، چالیس روپے دے کر لایا ہوں اب جو آپ کا دل کرے دے دو۔“

”اگر مناسب سمجھو تو اس کے سو روپے دیے دیتا ہوں۔“ ان کی جانب سے اعتماد بھرے لہجے میں کہا گیا۔
”سو روپے؟“ وہ شاید چالیس کے مال پر ساٹھ روپے کے منافع پر خوش تھا۔

”چلو اگر تم سو پر خوش نہیں ہو تو یہ لو ایک سو بیس روپے۔“ انھوں نے بنیان کی اندرونی جیب سے نوٹوں کی گڈی سے بیس بیس کے چھ نوٹ گن کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
کباڑی کو دُگنا منافع مل رہا تھا، اسے بھلا کیا انکار ہوتا۔

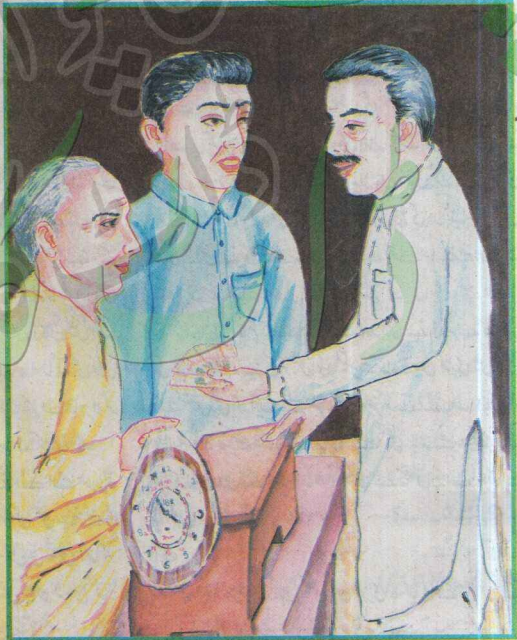
”ایا ابا.....“ نجف کو لگا تھا کہ اس کے ابو یہ گھڑی خرید کر اچھا نہیں کر رہے۔

”ہاں، کبوتر“
”آپ اس کچرے کو کیوں خرید رہے ہیں؟“ اس نے انھیں روکنے کی کوشش کی۔

”کچرا..... اچھا.....“ وہ کچھ طنزیہ لہجے میں بولے۔

”جو مرضی دے دو باوجودی..... آپ سے کبھی کوئی حساب کتاب کیا ہے کیا۔“ کباڑی نے جواب دیا۔
”پھر بھی..... کچھ تو بولو.....“ نجف صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ان کی پرانی اشیا کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ مہنگائی نے لوگوں کی کمر توڑ رکھی تھی اس لیے لوگ اکثر ان کی دکان میں اپنے مطلب کی اشیا خریدنے آتے تھے۔ انھیں بھی پیچی گئی اشیا پر اچھا منافع مل جاتا اور یوں ان کا گھر اچھے انداز سے چل رہا تھا۔
نجف، میٹرک پاس تھا۔ اس کے پاس کوئی قابل ذکر کام تو نہ تھا اس لیے وہ یہ جائے ادھر ادھر بھٹکنے کے اپنے والد کی دکان پر بیٹھ جاتا تھا۔ والد شام کو اکثر دکان کے لیے مال کی خریداری کے لیے کباڑی محلہ میں موجود کباڑیوں کے گھروں کے



نکلتے دیکھا تو فوراً چلائے۔ اس کے بعد وہ اس کو قریبی اسپتال لے کر بھاگے۔ ڈاکٹر نے معائنے اور پٹی کرنے کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔

اکلی صبح جب اس نے اپنے کپوتروں کو اڑانا شروع کیا تو اس کی حیرت اس وقت بڑھی جب اس کا پرانا کپوتر لڈا دوبار کی اڑان کے بعد واپس نہیں آیا۔ انتظار۔۔۔ انتظار۔۔۔ اور کچھ انتظار۔۔۔ اب۔۔۔ کہ شاید اب آجائے، لیکن۔۔۔ اس کی یہ امید بر نہ آئی۔ اس نے صبح سے شام کر دی لیکن لڈا کو نہ آتا تھا اور وہ نہ آیا۔ اس کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔

اسے کل کا دُخم بھی یاد تھا، آج کپوتر بھی اڑ چکا تھا۔ یہ کپوتر اُس نے سات سو روپوں میں خریدا تھا۔ اسے یہ وہم ہو گیا کہ چون کہ ان کے گھر میں کہیں سے نحوست، گھڑی کی صورت میں آچکی ہے لہذا اب ان کے بُرے دن شروع ہو چکے ہیں۔

”بیٹا! تم عجیب سی باتیں کر رہے ہو۔ کسی چیز میں نحوست نہیں ہوتی۔“ ابا جان اسے سمجھا رہے تھے۔ وہ گھڑی کو نمٹوس قرار دے کر اسے دکان سے باہر پھینکنے کے قن میں تھا۔

”تم شاید سمجھ نہیں رہے۔ یہ ہماری دکان کا قیمتی اثاثہ ہے۔ میں ایک دن اس کی اچھی قیمت لے کر دکھاؤں گا۔“ وہ اس کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن وہ کسی طور یہ بات سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا۔

ایک ہفتہ بعد اس کی پیاری بہن سندس نویں کے امتحان میں ایک پیپر میں قفل ہو گئی تو اس نے اس عمل کو بھی اسی گھڑی سے منسوب کر دیا۔ گھڑی کی نحوست اس کے دل و دماغ پر بُری طرح چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو بھی اسی راہ پر لگانے میں مصروف تھا لیکن وہ اپنے شوہر کی رائے کو زیادہ اہمیت دیتی تھی۔

ایک روز اس کے ابا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ الٹیاں بند ہونے میں نہیں آ رہی تھیں، انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ دو روز بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ انتہائی رنجیدہ تھا۔ چھوٹی سی عمر میں گھر اور دکان کی ذمہ داری اس کے نازک کانڈھوں پر آچکی تھی۔ چھبڑ و ٹکٹن کے بعد جب اُس نے دکان

”مجھے معلوم تھا کہ آپ میری کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”بیٹا! یہ ایک اُن مول گھڑی ہے۔“
”اُن مول۔“ اب طنز کرنے کی باری اس کی تھی۔ وہ اس گھڑی کو مسٹر دکر چکا تھا۔ وہ اسے مفت میں بھی لینا پسند نہ کرتا، لیکن کیا کرے کہ اس کے باپ کو عجیب و غریب چیزیں خریدنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

”ابا! کیا یہ گھڑی خریدنا ضروری ہے؟“
”تھیں ایک دن اس گھڑی کے اچھے پیسے ملیں گے۔“
”کون خریدے گا ایسی گھڑی؟“ وہ بڑبڑایا۔ وہ سوچتا رہا۔ اگر اس کے والد کہتے تو وہ اس سودے کو خراب کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔

اس کے والد نے دیگر جگہوں پر سامان دیکھا اور پھر وہ گھڑی لے کر دکان پر آگئے۔ ابا نے اسے بہتر انداز سے صفائی کر کے ٹانگنے کا حکم دیا۔

نجف کو اس گھڑی سے نہ جانے کیوں نفرت سی ہو گئی تھی، لیکن وہ باپ کے حکم کے آگے مجبور تھا۔ اس لیے اس نے اسے توجہ سے صاف کرنا شروع کر دیا جیسے وہ آج کر رہا تھا۔ اس نے گھڑی ایک دیوار پر ٹانگنے کی کوشش کی۔ اتفاق سے کیل کم زور اور گھڑی وزن تھی اس لیے کیل اسے سہار نہ سکی اور دھڑام سے نیچے گر گئی۔

اب یہ اس کی بد قسمتی ہی تھی کہ گھڑی جس جگہ گری وہاں پر ایک بڑا سائیشے کا ٹکڑا پڑا تھا۔ جب گھڑی اس پر گری تو شیشہ چھٹکنے سے ٹوٹا اور اس کا ایک ٹکڑا نجف کے پاؤں میں لگنے کے باعث خون کا فوارہ سا پھوٹ نکلا۔

نجف کو یہ گھڑی ویسے ہی نہیں بھائی تھی اور اب تو اس واقعہ نے اس گھڑی کو اس کے لیے منحوس بنا دیا تھا۔ اس نے گھڑی کی جانب دیکھا، اس کا بال بھی بکا نہ ہوا تھا۔ اس نے زخمی پاؤں سے ہی اسے ٹھوکر ماری۔

”یا الہی خیر!“ ابا نے جب اس کے پاؤں سے خون

روپے دینے پر تیار ہے۔

”مجھے پتا ہے کہ تم لوگ اب نوادرات کی اہمیت سمجھنے لگ گئے ہو اس لیے..... دیکھو یہ پندرہ ہزار روپے لینے ہیں تو لے لو۔ اس سے زیادہ بالکل نہیں دوں گا۔“

وہ گھڑی کو بہت اچھی طرح پرکھ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ گھڑی اس کے لیے کارآمد ہے جب ہی تو اس نے ہزار ہزار کے پندرہ کراے نوٹ نکلا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔

جنف کی تو باچیس خوشی سے کھل گئی تھیں۔ اسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آپ اس گھڑی کا کیا کریں گے؟“ وہ حیرانی سے بولا۔

”یہ ایک مشہور کمپنی جیکبسن کی گھڑی ہے۔“ انھوں نے

وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”ایک انگریز ہرسال پاکستان آتا ہے اور

اس قسم کی گھڑیاں منہ مانگے داموں لے لیتا ہے، اس کا ذاتی میوزیم

ہے جہاں وہ ایسی ٹایاب اشیا رکھتا ہے جو برسوں قبل بنی تھیں۔“

”ادھ اچھا.....“ اس نے رقم لے کر اسے گھڑی ایک تھیلے

میں ڈال کر دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ شخص گھڑی لے کر چل دیا۔ اس کی

آنکھوں کے سامنے اپنے والد کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”بیٹا! یاد رکھو! کسی چیز میں کوئی منحوسیت نہیں ہوتی۔ جو

”تکلیف“ جو غم ہمارے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے وہ ہمیں مل کر رہے گا۔“

اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک عرصے تک

جس گھڑی کو اپنے لیے منحوسیت کا ذریعہ جانا اور اسے چھینک دینے

تک پر آمادہ رہا اور ایک سوئس روپے میں خریدی جانے والی وہ

گھڑی اسے پندرہ ہزار روپے دے گئی تھی۔ اس کے باپ کی کبھی

ہوئی یہ بات بھی پوری ہو گئی تھی کہ یہ گھڑی ایک روز نہیں اچھے

پیسے دے کر جائے گی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے گر پڑے۔ اسے معلوم

ہو گیا تھا کہ بڑے لوگوں کی باتوں میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور

پوشیدہ ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

کھونا شروع کی تو جیسے ہی اس کی نظر اس منحوس گھڑی پر پڑی تو اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ اس نے گھڑی کو دیوار سے اتار دیا۔ وہ اسے بیچ سڑک پر اچھالنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کو خیال آیا کہ اس کے ابا نے اس پر ایک سوئس روپے خرچ کیے تھے۔ اب اگر وہ اسے اسکرپ میں ڈال دیتا تو کوئی تیس تیس روپے تو آسکتے تھے۔ یہی سوچ کر اس نے دیگر فالتو سامان کے ساتھ اسے بھی اسٹور میں خنچ دیا۔

آج چھ ماہ بعد اس نے سٹور کی صفائی کی تو یہ گھڑی اس کی تمام یادوں کو پھر تازہ کر گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اسے دیوار پر ٹانگ دیا تھا۔ اب وہ اسے دیکھتا تو اُسے اپنے مزاج میں تبدیلی محسوس ہوتی اسے یہ اپنے مرحوم باپ کی نشانی محسوس ہو رہی تھی۔ پے درپے پڑنے والی ذمہ داریوں نے اسے کچھ سمجھ دار بنا دیا تھا۔

”ہاں بھائی! یہ گھڑی بیچو گے کیا؟“ ایک شخص اس کی دکان میں داخل ہوا تھا۔

”کیوں نہیں.....“

”کیا لوگ اس کا؟“

”جی.....“ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

”اچھا یہ بتا دو کتنے میں یہ گھڑی لی تھی؟“ اس نے کاروباری ترکیب استعمال کی۔

”آٹھ ہزار میں۔“ اس کے منہ سے ایسے ہی نکل گیا۔

”اب کیا لوگے؟“ وہ سادگی سے بولے۔

”آپ ہی بتادیں۔“

”بارہ ہزار روپے دے دوں!“

”کیا..... بارہ ہزار۔۔۔“ وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔

”کیوں، کیا کم ہیں۔“ وہ اس کی حیرت سے پریشان

ہو کر بولا۔ ”اچھا پندرہ ہزار لے لو۔“

وہ گھڑی کو ہاتھ میں لے کر اس کا اچھی طرح معائنہ کر

رہا تھا۔ جنف سوچ رہا تھا کہ اس اہم شخص کو اس دو ٹکے کی گھڑی

میں ایسی کیا بات نظر آئی کہ وہ سو روپے کی چیز کے بارہ ہزار



کیل دس منٹ کا

ک	ی	و	ظ	غ	ا	ل	م	ا	ی
ٹ	م	ل	ڈ	س	و	پ	گ	ھ	ط
ب	ڑ	ا	ف	چ	غ	ن	ز	چ	ن
ش	گ	خ	ش	ا	خ	ت	س	ا	ح
م	ز	ی	ا	د	ہ	د	ب	و	ن
ا	ق	ک	ل	ا	ت	ن	ر	ب	د
ٹ	ش	ی	ے	ر	د	خ	ض	ک	م
و	م	ن	ا	ب	ح	ق	ا	ط	ش
ھ	ع	ر	ے	د	پ	ن	س	ت	ش
چ	ن	ت	ف	س	ج	ھ	و	ٹ	ا

آپ نے حروف ملا کر دس متضاد الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن متضاد الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

نیک، بد، سچا، جھوٹا، اچھا، بُرا، چھوٹا، بڑا، کم، زیادہ۔

یہاں قدم جمانے لگے۔ اپنی سیاست اور مکارانہ منصوبہ بندی کے ذریعے مسلمان ریاستوں کو کمزور کر کے ان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی ایک اہم ریاست میسور پر بھی وہ لپٹائی نظریں جمائے ہوئے تھے۔

میسور کے حکمران نواب حیدر علی کے ہاں جب ایک لمبے عرصے تک اولاد نہ ہوئی تو ان کی بیوی

نے انہیں دعا کے لیے مشہور بزرگ ٹیپوستان ولی کی درگاہ پر جانے کا کہا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور 10 نومبر 1752ء کو نواب حیدر علی کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا، اس کا نام اسی بزرگ کی نسبت سے ”ابوالفتح علی ٹیپو“ رکھا گیا۔ جو بعد میں ٹیپو سلطان کے نام سے معروف ہوئے۔

چند ہی برسوں میں جنوبی ہند کی اس ریاست نے ایک عظیم مملکت کا روپ دھار لیا۔ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کی بہترین انداز میں تربیت کی۔ ٹیپو نے بچپن ہی میں شمشیر زنی، تیر اندازی، گھڑ سواری، کشتی اور تیراکی میں مہارت حاصل کر لی۔ مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی، عربی، فرانسیسی، اردو اور فارسی زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔ ٹیپو سلطان اپنے باپ کی طرح پکا حریت پسند تھا۔ بہادری کا یہ عالم کہ صرف 11 برس کی عمر میں بدفور کے میدان میں والد کے شانہ بہ شانہ جنگ میں حصہ لیا۔

رانا محمد شاہد

ٹیپو سلطان

”بچپن اسلام ازم“ (عالم اسلام کا اتحاد) یہ نعرہ عالم اسلام کے ایک بہت بڑے عالم سید جمال الدین افغانی نے انیسویں صدی کے آخر میں لگایا تھا۔ ترکی کے سلطان نے اس نعرے کی سرپرستی کی۔ بعد میں یہی نعرہ پہلی عالمی جنگ میں ترکوں کا جنگی نعرہ بن گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کے اتحاد کا یہ خیال جنوبی ہند

کی ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کے حکمران کو سو برس پہلے آگیا تھا کہ عالم اسلام کو متحد کر کے ہی طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ریاست میسور کے اس حکمران نے ترکی کے سلطان سے خط و کتابت کی اور کہا کہ بصرہ کی بندرگاہ سے ترکی اپنا بحری بیڑہ خلیج فارس کے راستے جنوبی ہند بھیجے۔ اس نے افغانستان کے حکمران شاہ زمان کو لکھا کہ وہ اس کی مدد کے لیے آئے۔ اس نے ایران کے حکمران سے بھی خط و کتابت کی کہ دونوں ممالک میں خیر گالی کے تعلقات قائم ہونے چاہئیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچپن اسلام ازم (عالم اسلام کا اتحاد) کا یہ خیال سید جمال الدین افغانی سے سو برس پہلے میسور کے حکمران سلطان فتح علی ٹیپو کے ذہن میں آیا تھا۔ اس لحاظ سے ٹیپو سلطان کو بچپن اسلام ازم کے نظریے کا بانی کہا جاسکتا ہے۔

انگریز برصغیر میں تجارت کے بہانے آئے اور پھر آہستہ آہستہ

بدقسمتی سے نیپولین بونا پارٹ دریائے نیل کی لڑائی ہار گیا۔ ادرہ ہندوستان میں انگریز ٹیپو کو اکیلا کر کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ سلطنتِ میسور کے دارالحکومت سرنگاپٹم کا محاصرہ کیا گیا۔ بات صلح پر ختم ہوئی مگر اس کے عوض ٹیپو کو آجی سلطنت اور تین کروڑ تیس لاکھ تانواں دینا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے ایک ”عہدِ معاونت“ بھی متعارف کرایا۔ یہ عہد نامہ بھی دراصل انگریزوں کے مفادات کو تحفظ اور کمپنی کو فائدہ پہنچانے کے لیے تھا۔ اس عہد نامہ کی اہم شرائط یہ تھیں۔

- 1- ریاست انگریزوں کی مرضی کے خلاف کسی دوسری ریاست سے خارجی تعلقات قائم نہیں کر سکتی۔
- 2- ریاست پر ایک انگریز ریذیڈنٹ رکھا جائے گا۔
- 3- انگریز فوج کا ایک دستہ رکھنا ہوگا، اس کے اخراجات ریاست کو برداشت کرنا ہوں گے۔
- 4- انگریزوں کے علاوہ دیگر یورپی اقوام (خصوصاً فرانس وغیرہ) کے افراد کو نہیں رکھا جائے گا۔
- 5- ریاست کے اندرونی معاملات میں کمپنی دخل نہیں دے گی۔
- 6- ان تمام شرائط کے عوض کمپنی ریاست کو بیرونی و مقامی بغاوتوں سے نمٹنے میں مدد دے گی۔

ٹیپو سلطان کے سامنے یہ ”عہدِ معاونت“ آیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ انکار انگریز کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ انگریز فوجیں بھیجی اور مدارس سے میسور کی طرف بڑھنے لگیں۔

ٹیپو سلطان برصغیر کے وہ واحد حکمران ہیں جنہوں نے پے درپے سات نام ور انگریز برنیوں کو قیدی بنایا تھا۔ نظام حیدر آباد اور مرہٹوں نے مل کر ٹیپو سلطان پر حملہ کیا تو ٹیپو نے لگا تار چار سال تک ان کا مقابلہ کیا، انہیں شکست دی اور اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کامیابیوں کے بعد انگریز کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ٹیپو سلطان کو میدانِ جنگ میں شکست نہیں دے سکتے۔ چنانچہ انہوں نے ٹیپو سلطان کے گرد سازشوں کے جال بچے اور ان کے قریبی ساتھیوں اور مشیروں میں سے غدار تلاش کر لیے۔

اپریل 1799ء کے پہلے ہفتے انگریزوں نے دارالحکومت

ٹیپو سلطان ابھی صرف 21 برس کے تھے کہ حیدر علی نے انہیں مرہٹوں کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ آپ کی زبردست حکمت عملی کی بدولت مرہٹے بدعوا میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ٹیپو کو مرہٹوں کے خلاف اس مہم میں چار ہزار گھوڑے، سینکڑوں اونٹ اور 20 کے قریب ہاتھی مالِ غنیمت میں ہاتھ آئے۔ ٹیپو نے اپنے والد کے ساتھ بہت سی مہمات میں حصہ لیا اور کئی علاقے فتح کیے۔

نواب حیدر علی سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے بعد میسور کی دوسری جنگ کے دوران 22 دسمبر 1782ء کو وفات پا گئے۔ باپ کی وفات کی خبر ٹیپو کو دورانِ جنگ ملی۔ 2 جنوری 1783ء کو سراگ کے ساتھ تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اپنے پہلے خطاب میں ٹیپو نے مادرِ وطن کو مخاطب کر کے کہا۔

”اے میرے پیارے وطن! میری محبت اور میرا دل میری حیات اور میرا وجود، میرا خون اور میری جان تیرے لیے ہے۔“

ٹیپو سلطان کا نظام سلطنت مثالی تھا۔ انہوں نے میسور کی عظیم سلطنت کی بہتری اور اپنی رعایا کو سہولتیں دینے کے لیے بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ ٹیپو سلطان نے تعمیری اور مثبت اصلاحات کے ذریعے اپنی سلطنت کو صنعتی، تعمیراتی، زرعی، معاشرتی، فوجی، تہذیبی و تمدنی اور دیگر شعبہ جات میں خود کفیل بنا دیا۔ نئے فوجی قوانین کے ذریعے فوج کو منظم و فعال کیا۔ اسلحہ سازی و جہاز سازی کے کارخانے قائم کیے اور بحریہ کو فروغ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار راکٹ ٹیپو کے دور میں ہی بنائے اور چلائے گئے تھے۔

ٹیپو سلطان کو بدلتے وقت اور حالات کا بخوبی ادراک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انگریز اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ انگریزوں نے مرہٹوں اور نظام دکن کے ساتھ ساز باز جاری رکھی۔ چنانچہ ٹیپو نے ریاست کی بہتری اور انگریزوں سے ہمدردی نہ ہونے کے لیے بیرونی دنیا میں خصوصاً ترکی، ایران، افغانستان اور فرانس کے حکمران نیپولین بونا پارٹ سے رابطے کئے۔ فرانسیسیوں کی مدد سے فوج کو جدید خطوط پر استوار کیا تاکہ انگریز کو منہ توڑ جواب دیا جا سکے، لیکن انگریز نے ایک لمبی چال چلی۔ انگریز نے ترکی کو روس سے لڑایا، پھر افغانستان اور ایران میں خانہ جنگی کرا دی۔ ادرہ

نے انہیں مردہ سمجھ کر ان کا قیمتی کمر بند اتارنا چاہا تو شدید زخمی ہونے کے باوجود تلوار کے ایک بھر پور وار سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ شدت پیاس اور مٹی کی دھکی گرمی کے باوجود بہادری سے لڑتے ہوئے اس اولین شہید آزادی..... ٹیپو سلطان نے غروب آفتاب کے وقت جام شہادت نوش کیا۔

ٹیپو سلطان پیاسا کیوں تھا؟ اس لیے کہ غدار اپنا کام کر چکے تھے۔ سلطان کے اکثر ساتھی حتیٰ کہ خادم بھی جن کے پاس پانی کا چھال تھا۔ انگریزوں کے ہاتھوں تک چکے تھے۔ دربار کے اہم لوگوں نے نشاندہی کر کے انگریز فوج کو قلعہ میں داخل کیا۔ جب چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر یہ بہادر کمانڈر اپنے ملک پر قربان ہونے کے لیے انگریز فوج کے سامنے سینہ سپر ہوا تو ان ساتھیوں میں سے بھی کئی پست ہمت و غدار نکلے۔ ٹیپو سلطان نہایت بہادری سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہا تھا، جب گرمی کی شدت اور پیاس سے پریشان ہو کر خادم سے پانی طلب کیا، مگر اسے پانی ندل سکا اور پھر یہ بہادر جرنیل غروب آفتاب کے ساتھ ہی غروب ہو گیا، مگر اپنے اس قول سے انسانوں کو ایک روشن پیغام دے گیا۔

”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“



مرنگ پاٹم کا محاصرہ کر لیا۔ قوم کے غدار اپنے کام کر چکے تھے۔ ان غداروں میں میر صادق، غلام علی لنگڑا اور پورنیا نمایاں تھے۔ چنانچہ ٹیپو سلطان قلعہ بند ہو گیا۔ انگریزوں کی شدید گولہ باری سے قلعہ کی ایک دیوار گر گئی۔

4 مئی 1799ء کو دن کے ایک بجے جنگ آزادی کے اس شیر دل کمانڈر نے گھمبیر صورت حال کو دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص جاں نثاروں کے ساتھ انگریز حملہ آوروں سے لڑائی شروع کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطان نے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ انہیں حملے کی اطلاع ملی۔ ایہوں کی غداری تو وہ پہلے ہی جان چکے تھے چنانچہ اسی غداری کے پیش نظر انہوں نے کھڑے پر سوار ہونے سے پہلے کہا۔

”خدا کی قسم! یہ قوم روٹی کے ایک ایک ٹکڑے اور پیاز کی ایک ایک قاش کو ترسے گی۔“ پھر وہ ڈٹن پر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ایک موقع پر ٹیپو چاروں طرف سے انگریز فوج کے گھیرے میں آ گئے۔ مٹی کی دھکی گرمی اور سات گھنٹے کی مسلسل جنگ نے انہیں مڑھال کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ نہایت بہادری سے انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کا گھوڑا زخمی ہو کر گر گیا تو انہوں نے پیل لڑائی جاری رکھی۔ اچانک ایک گولی ان کے دل پر لگی اور وہ زخمی ہو کر گر گئے۔ ایک انگریز سپاہی

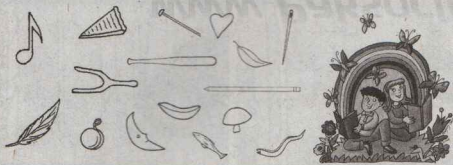
دُعا

دُعا پر اعتماد ہی جتنی ہے جب ہم تنہائی اور خاموشی میں دُعا مانگتے ہیں تو ہم اس یقین کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا اللہ تعالیٰ ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی کی زبان بھی جانتا ہے، دُعا میں خلوص آنکھوں کو مٹھ کر دیتا ہے اور یہی آنسو دُعا کی منظوری کی دلیل ہیں، دُعا زمانے بدل دیتی ہے، گردشِ روزگار کو روک سکتی ہے، جب تک سینے میں ایمان ہے، دُعا پر یقین ہے۔ جس کا دُعا پر یقین نہیں اس کے سینے میں ایمان نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں دُعاؤں کی افادیت سے مایوس نہ ہونے دے۔

دُعا کو پتھیرا کے طور پر استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ دُعائیں کرنی چاہئیں۔ بالخصوص یہ دُعا کرنی چاہیے۔ ”اے اللہ مجھے ایسا بنا دے کہ تجھے پسند آجائوں اور اے اللہ مجھے ہدایت پر قائم رکھ۔ دُعا میں تمام قبول ہوتی ہیں، ضائع نہیں ہوتیں۔ رو بہِ محشر ایک شخص حاضر ہو گا وہ نیکیاں دیکھے گا جو اس نے کی ہوں گی اور کچھ اور بھی جو اس نے نہیں کی ہوں گی وہ کہے گا یہ کہاں سے آگئیں تو اس سے کہا جائے گا یہ ان دُعاؤں کا اجر ہے جو نہایت قبول ہوئی تھیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”دُعا عبادت کا مغز ہے یعنی دُعا کے بغیر عبادت بے معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت بلاشبہ جوش میں آ جاتی ہے جب اس سے گڑگڑا کر دُعا مانگی جائے اور اپنے لیے مدد طلب کی جائے۔ وہ سننے والا، مدد کرنے والا اور مشکل کشا ہے لہذا جب بھی کوئی پریشان آئے تو اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دُعا مانگیں اور یہ یقین رکھیں کہ ہماری دُعا ضرور قبول ہوگی۔

(قمران دہلوی، کراچی)



یہ چیزیں خا کے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔





ایک تھی چڑیا

دقار محسن

بستے ہیں۔ تم اگر ان کے لئے کوئی پیغام دینا چاہو تو دے دو۔ میں ان تک تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔“

چڑیا نے افسردگی سے کہا۔

”گلاب! میرے عزیزوں اور سہیلیوں سے کہنا کہ ان کی سہیلی قید میں بہت اداس ہے۔ گوکہ پنجرہ سونے کا ہے اور عمدہ عمدہ کھانے میسر ہیں، لیکن وہ آزادی کی نعمت سے محروم ہے۔ وہ ان دنوں کو یاد کرتی ہے جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہوا میں جھومتی شاخوں پر چھبھاتی تھی۔ جب بارش کی پھوار میں سب ل کر اونچی اڑان بھرتے تھے اور بادلوں میں آنکھ پھولی کھیلتے تھے۔ جب وہ سب کے ساتھ درختوں پر امرود، سیب اور ناشپاتیاں کھاتے تھے۔ اور جب رات کو اندھیرا اور سناٹا چھا جاتا تو وہ اپنی ماں کے نرم گرم پروں میں چھپ کر خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی تھی۔“

اتنا کہہ کر چڑیا نے اپنا ایک پر گلاب کو دے دیا اور کہا کہ وہ اس کو اپنی گھڑی میں لگا لے تاکہ جنگل میں چڑیا کے ساتھی اس کو پہچان لیں۔

گلاب خاں چڑیا کی باتیں سن کر اداس ہو گیا۔ اس کو چڑیا کے غم کا اندازہ تھا لیکن اس کو چڑیا اور اس کے سریلے نغموں سے اتنا پیار تھا کہ وہ اس کو آزاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔

گلاب خاں کو اپنی دھنک رنگوں والی چڑیا سے بہت پیار تھا۔ جب صبح کو سورج کی سنہری کرنیں اس کے مخمل جیسے پروں پر پڑتیں تو وہ ستاروں کی طرح چمک اٹھتے۔ اس انوکھی چڑیا کی آواز میں جادو تھا۔ جب وہ پنجرے کی تیلیوں سے سر نکا کر سریلے گیت گاتی تو اس کی جادو بھری آواز سن کر ہوا بھی رک جاتی اور بادلوں کی ٹکڑیاں بھی بہت نیچے اتر آتیں۔ گلاب خاں نے اپنی پیاری چڑیا کے لیے سونے کی جالیوں والا پیچھڑا بنوایا تھا جس میں ننھے ننھے بلب روشن رہتے۔ دانے اور پانی کے لئے ننھی ننھی چاندی کی کنوئریاں رکھی رہتیں۔ جب گلاب خاں چڑیا سے اس کی اداسی کا سبب پوچھتا تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”گلاب! مجھے معلوم ہے تم مجھ سے بہت پیار کرتے ہو، لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ زنجیر چاہے ہوسے کی ہو یا سونے کی وہ آزادی چھین لیتی ہے اور آزادی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی قیمتی چیز نہیں۔“

جب پہاڑوں کی برف پگھلنا شروع ہوئی اور گلاب خاں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے شہد کے کاروبار کے سلسلے میں سفر پر روانہ ہوا تو اس نے چڑیا سے پوچھا۔

”پیاری چڑیا! میں سفر کے دوران ان جنگلوں سے گزروں گا جن کا تم اکثر ذکر کرتی ہو اور جہاں تمہارے رشتہ دار اور سنگی ساتھی

سے پوچھا۔

”گلاب! تم نے میرا پیغام میرے ساتھیوں کو پہنچایا ہے یا نہیں۔“
 ”میں نے تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے، جنگل میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ جب میں تمہارا پیغام چڑیوں کو سنا رہا تھا تو ایک تمہارے ہی جیسے پروں والا چڑیا مار کر چڑی کی شاخ سے گرا اور اس کا جسم بے جان ہو گیا۔“

اتنا سنتے ہی چڑیا کی چیخ ابھری اور اس کا بھی بے جان جسم پنجرے کے جمولے سے نیچے گر گیا۔

گلاب خاں نے آہ بھر کر کہا۔
 ”آج میری پیاری چڑیا مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ شاید جنگل میں درخت سے گرنے والا چڑیا اسے بہت عزیز تھا۔ کاش میں پہلے ہی اس کو آزاد کر دیتا تو دو جانیں بچ جاتیں۔“

گلاب خاں نے بوجھل دل کے ساتھ پنجرے کا دروازہ کھولا اور چڑیا کے بے جان جسم کو گھاس پر لٹا کر درخت

کے نیچے گڑھا کھودنے لگا تاکہ چڑیا کو دفن کر سکے۔ کچھ دیر بعد چڑیا پھر سے اڑ کر اتار کے درخت پر جا بیٹھی اور مسر کر کہنے لگی۔

”گلاب! خدا حافظ، میرے ساتھی نے جنگل میں موت کا بہانہ کر کے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے موت کو بھی گلے لگانا پڑتا ہے۔ موت کے انتخاب نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔“
 (مرکزی خیال ماخوذ)

☆.....☆.....☆

جب گلاب خاں پہاڑوں کے دامن میں واقع اس جنگل سے گزرا تو اس کی چوڑی میں گئے چڑیا کا پردیکھ کر بہت سے پرندوں نے اس کو گھیر لیا۔ ایک چڑیا نے اس کے کندھے پر بیٹھ کر پوچھا۔
 ”مسافر! ہماری پیاری چڑیا کہاں ہے؟ ہم سب اس کے لئے بے چین ہیں اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“

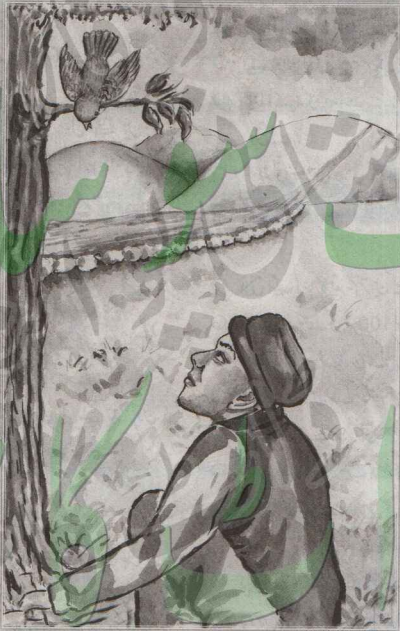
گلاب نے کہا:

”پیاری چڑیو! یوں تو تمہاری سہیلی کو دنیا کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ رہنے کے لیے سونے کا گھر ہے۔ مزے مزے کے پھلوں کے ڈھیر ہیں، لیکن مجھے مجبوراً اسے پنجرے میں رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ مجھے اس چڑیا سے بہت پیار ہے اور میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے تمہاری سہیلی بہت اداس رہتی ہے۔ گھنگھور گھٹاؤں، بارش کی بوجھاڑ، پیڑوں پر آزادی سے چپکتے پھدکتے پرندوں کو دیکھ کر وہ

بہت غم گین ہو جاتی ہے۔ وہ ان دنوں کو یاد کرتی ہے جب وہ تم سب کے ساتھ بانگوں میں سریلے نغمے گاتی تھی۔“

ابھی گلاب نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک دردناک چیخ ابھری اور ایک خوب صورت چڑیا درخت کی شاخ سے زمین پر آگرا۔ گلاب حیرت سے ٹھٹھک گیا۔ اس کے سامنے چڑے کا بے جان جسم پڑا تھا۔

جب گلاب خاں اپنے سفر سے واپس آیا تو چڑیا نے بے چینی





معلومات عامہ

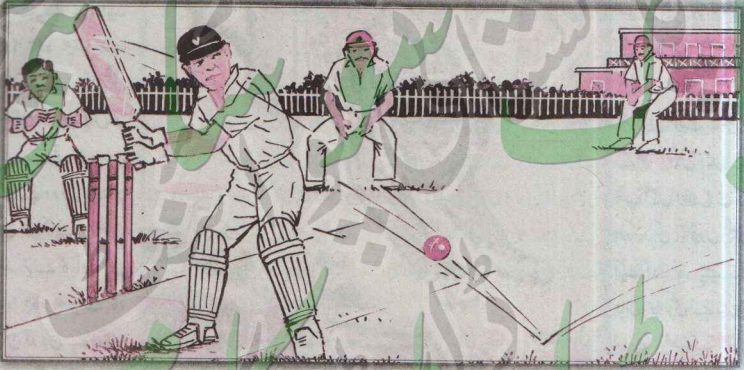


- حضرت ابو ہریرہؓ کو سلطان المدیث کہا جاتا ہے۔
- حضرت خالد بن ولیدؓ نے میدان جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔
- حضرت سلمان فارسیؓ نے مدینہ کی حفاظت کے لیے خندق کھودنے کی رائے دی تھی۔
- حضرت زید بن حارثہؓ وہ واحد صحابی رسول ﷺ ہیں جن کا نام قرآن مجید میں آیا ہے۔ (منازل فرسان، راول پنڈی)
- دُنیا میں سب سے زیادہ رکھا جانے والا نام محمد ہے۔
- شہد کی مکھی کو سرخ رنگ نظر نہیں آتا۔
- چیونٹیاں کبھی نہیں سوتیں۔
- ککول ایک ایسا پرندہ ہے جو کبھی اپنا گھونسلہ نہیں بناتا۔
- اگر کچھو کے اڈر گداگ لگا دی جائے تو وہ خود اپنے سر کو ڈس لیتا ہے۔
- ناشپاتی کا درخت 30 سال تک پھل دیتا ہے۔
- چھینک کو روکنے کی کوشش میں گردن یا دماغ میں خون کی شریان پھٹنے سے موت واقع ہو سکتی ہے۔
- (ارم زیادہ کھوئی رنہ)
- پاکستان میں 32 زبانیں بولی جاتی ہیں۔
- پاکستان میں سب سے زیادہ زبانیں بلوچستان میں بولی جاتی ہیں۔
- پنجابی زبان کا شمار برصغیر کی قدیم زبانوں میں ہوتا ہے۔
- 93 گنبدوں والی مسجد ”شاہ جہاں مسجد“ سندھ کے قدیم شہر ٹھٹھہ میں واقع ہے۔
- (محمد خرم خالد، کراچی)
- کٹ فش کے تین دل ہوتے ہیں۔
- چھھر کے منہ میں چوالیس دانت ہوتے ہیں۔
- ہنڈر کے دو دماغ ہوتے ہیں۔
- کاکروچ کے خون کا رنگ سفید ہوتا ہے۔
- کتے کی زبان پر پسینہ آتا ہے۔
- شہد کی مکھی کی پانچ آنکھیں ہوتی ہیں۔
- خون کی اقسام کارل لینڈ نے دریافت کیں۔
- مسجد نبوی ﷺ میں سب سے پہلے اذان حضرت بلالؓ نے دی۔
- مزار اقبالؒ کا نقشہ ماہر تعمیرات ”زین یار جنگ“ نے تیار کیا۔
- ایک جوان آدمی کے جسم میں قریباً چھوٹا خون ہوتا ہے۔
- تانا ایک ایسی دھات ہے جو خالص حالت میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ (محمد بن احمد، سہاسی وال)
- ”واٹر لی“ پھول کو پانی کی مکد کہا جاتا ہے۔
- دُنیا میں پہلا بیگ 1808ء کو اٹلی میں قائم ہوا۔
- (احمد علی، قصور)
- لال بیگ دُنیا کا قدیم ترین کپڑا ہے۔
- طوطے اور کوئے کی عمر 100 سال سے زیادہ ہوتی ہے۔
- دُنیا کا پہلا کمپیوٹر باریج نے ایجاد کیا تھا۔
- دُنیا کا امیر ترین ملک سوئٹزر لینڈ ہے۔
- دُنیا کا سب سے بڑا صنعتی شہر شنگائی ہے۔
- دُنیا کا سب سے غریب ملک کانگو ہے۔
- مصو غم کا خطاب مولانا راشد الخیری کو دیا گیا تھا۔
- (عمیر شاہد، جھنگ)
- دُنیا کا قدیم ترین پرچم ڈنمارک کا ہے۔
- پھولوں اور میلوں کا شہر شیراز (ایران) کو کہا جاتا ہے۔
- افریقہ کے شہر ”نیم زان“ میں تمام مکانات ٹمک کے ہیں۔
- سورج ہماری زمین سے 10 لاکھ گنا بڑا ہے۔
- چاند ایک سال میں تقریباً 13 بار زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ (حمزہ علی، راول پنڈی)
- شیر کی اوسط عمر 20 سے 25 برس ہوتی ہے۔
- زکام صرف انسان اور بن مانس کو ہوتا ہے۔
- نائل انسانی دل کا وزن تقریباً 12 اونس ہوتا ہے۔
- (معاذ احمد صدیقی، کندیاں)

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

پرائم ایون اور گولڈن ایون کے درمیان گول باغ میں کرکٹ میچ جاری تھا۔ پرائم ایون نے پہلے کھیلے ہوئے مقررہ میں اوورز میں 149 رنز بنائے تھے، جس کے جواب میں گولڈن ایون نے 125 رنز بنائے تھے۔ اب صرف چار گیندوں کا کھیل باقی تھا۔ گولڈن ایون کو میچ جیتنے کے لیے چار گیندوں پر 25 رنز کی ضرورت تھی۔ گولڈن ایون کے بلے باز ہمایوں نے آخری چار گیندوں پر 25 رنز بنا کر اپنی ٹیم کو فتح سے ہم کنار کر دیا۔ آپ نے کھوج لگانا ہے کہ چار گیندوں پر 25 رنز کیسے بنے تھے۔



اپریل 2012ء میں شائع ہونے والے ”کھوج لگائیے“ کا صحیح حل: کامران نے ”سلوسائیکلنگ“ میں حصہ لیا تھا۔ اس کھیل میں پیچھے رہ جانے والا سائیکل سوار انعام کا حق دار قرار پاتا ہے۔

- 1- محمد نعمان شیخ، کشمور
- 2- نعمان فہیم، لاہور
- 3- محمد طیب، فیصل آباد
- 4- سمیتہ اشرف، اسلام آباد
- 5- نوید الرحمن، انک۔

ہر مل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب پیچھے کی آخری تاریخ 10 مئی 2012ء ہے۔

نام: _____

پتا: _____

کھوج

لگائیے!



شکاریات

خطرناک چیتا



کاشت نیائی

غرض سے ڈاکٹروں کا ایک وفد ان ملکوں میں روانہ کیا، میں بھی جس میں شامل تھا۔ وفد نے ایک ایک ہفتہ ان تینوں ملکوں میں گزارنا تھا۔ اور یہاں کے لوگوں کے طبی مسائل ایک رپورٹ کی صورت میں اقوام متحدہ کے سامنے پیش کرنا تھے۔

ہم اُس وقت نائیجیریا کے شہر ”رویش“ میں تھے جب ہمیں اطلاع ملی کہ اردگرد کی بستیوں میں ایک آدم خور چیتے نے تباہی مچا رکھی ہے۔ نہایت خطرناک تھا۔

یہاں تک کہ بعض اوقات دن دیہائے انسانوں پر حملہ کر دیتا تھا۔ دراصل یہ آدم خور چیتا، چیتوں کی اُس نسل سے تعلق رکھتا تھا جن کی جلد پر سیاہ دھبے ہوتے ہیں۔ ایسے چیتے نائیجیریا کے جنگلوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ عام طور پر ہرن اور نیل گائے کا شکار کرتے ہیں۔

جس چیتے کا میں ذکر رہا ہوں وہ آدم خور اس طرح بنا کہ اُس نے ایک مرتبہ ایک بستی میں گھس کر واردات کی تھی۔ یہ بستی گھانئس پھونس کی جھوپڑیوں پر مشتمل تھی۔ چیتا خوراک کی تلاش میں اس طرف آیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ چیتے نے ایک جھوپڑی میں گھس کر ایک پندرہ سالہ لڑکے کو منہ میں دبوچا اور نکل گیا۔ جتنی دیر میں لوگ بیدار ہو کر چیتے کا تعاقب کرتے اتنی دیر میں چیتا جنگل میں روپوش ہو چکا تھا۔

مجھے افریقہ کے جنگلوں میں گزرنے والی شکار کی وہ راتیں کبھی نہ بھولیں گی جب ہم ایک اونچے درخت پر چمان باندھے دو دن سے آدم خور چیتے کا انتظار کر رہے تھے۔ درخت کے نیچے ایک موٹا تازہ بھیٹا بندھا ہوا تھا۔ ہمیں یہ اُمید تھی کہ آدم خور چیتا چوں کہ اس علاقے میں ہے اس لیے وہ دن یا رات میں اس بھینے پر ضرور حملہ کرے گا اور یوں ہمارا شکار ہو جائے گا، لیکن دو دن کے انتظار

کے بعد بھی چیتا اس طرف نہ آیا۔ یہ واقعہ جو میں آپ کو سنائے والا ہوں میری شکاری زندگی کا یادگار واقعہ ہے۔ لیکن بہتر ہے کہ اسے سننے سے پہلے میں آپ کو اپنا تعارف کروا دوں۔

میں ایک میڈیکل ڈاکٹر ہوں اور زندگی میں پیش آنے والے چند اتفاقی حادثات کی وجہ سے شکاری بنا۔ ہوا یوں کہ آج سے چند سال قبل افریقہ کے تین ملکوں گھانا، بروڈی اور نائیجیریا میں ملیریا بخار کی شدید وبا پھوٹ پڑی۔ ان ملکوں میں ایک مخصوص جھڑپایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو ملیریا بخار سے سابقہ پر ڈار ہوتا ہے، لیکن چند سال قبل ملیریا وبا کی صورت اختیار کر گیا اور اس وجہ سے ان ملکوں میں بہت سی اموات ہوئیں۔

چوں کہ یہ تینوں ملک بہت پسماندہ ہیں اور یہاں کے لوگ انتہائی غریب ہیں اس لیے اقوام متحدہ نے ان کے علاج معالجہ کی

وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا، لیکن جب میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ کچھ پریشان سا ہو گیا اور کہنے لگا:

”سر! اس خطرناک چیتے کو تو ماہر شکاری بھی ہلاک نہیں کر سکے۔ آپ کا شکار کا اتنا زیادہ تجربہ بھی نہیں ہے پھر آپ یہ کام کیسے کر لیں گے؟“

”مشرایڈرن! آپ اس بات کی بالکل فکر نہ کریں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا نشانہ بہت عمدہ ہے اور مجھے خدا پر بھروسہ ہے مجھے یقین ہے کہ میں اس چیتے کا شکار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ مجھے چیتے کو ہلاک کرنے کی قانونی اجازت دے دی جائے۔ اس کے بعد مجھے ایک فوجی رائفل اور گولیوں کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی فراہم کر دیا گیا۔ بعد ازاں میں ان شکاریوں سے بھی ملا جو آدم خور چیتے کو ہلاک کرنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ ان شکاریوں میں ایک بوڑھا شکاری کا گواہوں بھی تھا۔ وہ بے قد کا ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ اُس کی ساری زندگی افریقہ کے گھنے جنگلوں میں درندوں کا شکار کھیلے گزری تھی۔ اگرچہ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا، لیکن اب بھی اُس کی جسمانی صحت قابل رشک تھی۔ اُس نے مجھے چیتے کے بارے میں بہت سی اہم معلومات فراہم کیں۔ باتوں باتوں میں اُس نے مجھے یہ بتایا کہ آدم خور چیتا آخری مرتبہ روبش شہر کے شال کی طرف موجود جنگل میں دیکھا گیا ہے۔

میرے لیے یہ اطلاع بہت اہم تھی۔ روبش شہر کا شمالی جنگل انتہائی گھنا اور دشوار گزار تھا۔ اس جنگل میں سے ایک ندی بھی تھی جس کا پانی بہت شفاف اور گہرا تھا۔ چنانچہ میں نے ضروری تیاری کی اور اپنا شکاری سامان لے کر شمالی جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے ساتھ ایک تیس سالہ نوجوان جوزف بھی تھا۔ جوزف آدم خور چیتے کو ہلاک کرنے کے معاملہ میں خاصا بڑے جوش تھا۔ اُس نے بڑی عاجزی سے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس شکاری مہم میں اسے بھی اپنے ساتھ شامل کر لوں جسے میں نے قبول کر لیا۔ جوزف ایک ماہر شکاری تھا اور اُس کے پاس اس کی اپنی ایک بہترین رائفل تھی۔ ہم نے چند لوگوں کی مدد سے جنگل کے درمیان ایک اُونچے

آدم خور درندوں کے شکاری اس بات کو جانتے ہیں کہ جب کسی درندے کے منہ کو انسانی خون کی چاٹ لگ جائے تو پھر وہ اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔ چیتے نے اپنا دوسرا شکار اس کے چند روز بعد ہی کیا۔ وہ اس طرح کے افریقہ کے ان ملکوں میں رواج ہے کہ لوگ قافلے کی صورت میں سفر کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک قافلہ جنگل سے گزر رہا تھا۔ یہ لوگ سستانے کے لیے درختوں کے نیچے رک گئے۔ اچانک قریبی جھاڑیوں میں سے چیتا نکلا اور ان پر حملہ کر دیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ قافلے کے مسافر شور مچانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے۔ چند جوانوں نے اپنی جان بچاتے ہوئے چیتے کو پتھر بھی مارے لیکن اتنی دیر میں چیتا ایک آدمی کو ہلاک کر کے جھاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔

ان دو واقعات کے بعد اردگرد کے علاقوں میں خوف پھیل گیا اور کاروبار زندگی معطل ہو گیا۔ کئی شکاریوں نے اپنے طور پر چیتے کو ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ چیتا انتہائی چالاک جانور ہے وہ شکار کے فوراً بعد ہی اپنی جگہ تبدیل کر لیتا ہے۔ اس وجہ سے شکاری تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اور آدم خور چیتا اسی طرح انسانوں کا شکار کرتا رہا۔

جن دنوں ہم وہاں تھے۔ اردگرد کی ساری بستیوں میں آدم خور چیتے کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ خوف کی وجہ سے نہ گھر سے نکلتے تھے اور نہ ہی کام کاج پر جاتے تھے۔ مجھے اُن کی یہ حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا تھا چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ضرور لوگوں کو اس خوف خوار درندے سے نجات دلاؤں گا۔

جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ میں کوئی پیشہ ور شکاری نہیں ہوں لیکن میں نے جوانی میں نشانہ بازی کی تربیت لی ہوئی تھی، اُن دنوں یہی تربیت میرے بہت کام آئی۔ چنانچہ میں نے اپنے گروپ کے ڈاکٹروں سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ محکمہ جنگلات سے آدم خور چیتے کو ہلاک کرنے کی اجازت لی جائے۔ اگلے ہی دن میں محکمہ جنگلات کے دفتر میں موجود تھا۔ دفتر کے مقامی افسر کا نام اینڈرن مور یو تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا اور روانی سے انگلش بولتا تھا۔



اندر آہستہ آہستہ بھینسے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پھر اچانک درختوں پر موجود بندروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

ناخیریا کے جنگلوں میں سیاہی مائل سرخ رنگت کے چھوٹے چھوٹے بندر پائے جاتے ہیں۔ ان بندروں کی ایک خاص عادت ہے جو تقریباً تمام شکاریوں کو معلوم ہے کہ جب یہ کسی بڑے درندے کو دیکھتے ہیں تو خوب شور مچاتے ہیں۔

مجھے اُس وقت یہ لگا کہ شاید جھاڑیوں میں کوئی خون خوار جانور موجود ہے جسے دیکھ کر بندریوں شور مچا رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے آہستگی سے رافٹل کا باٹ اپنے کندھے پر لٹکا لیا اور جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جوزف نے بھی ایسا ہی کیا۔

جھاڑیوں میں حرکت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ اچانک درخت کے نیچے بندھے بھینسے نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ اس دوران بندروں کا شور بھی بڑھ گیا۔

درخت پر مچان بندھوائی اور درخت کے تنے کے ساتھ ایک موٹا تازہ بھینسا بندھوا دیا۔ یہ بھینسا ہمیں مقامی لوگوں نے مہیا کیا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا کہ افریقہ کے اس گھنے جنگل میں ہم دو دن اور دو راتوں سے آدم خور چیتے کا انتظار کر رہے تھے، لیکن چیتے کو شاید اس طرف نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا۔

یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے۔ ہم صبح سے ہی مچان پر تھے بیٹھے تھے۔ صبح سے لے کر اب تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن سہ پہر کے وقت جب سورج کی تپش ذرا کم ہوئی تو ہمارے سامنے تقریباً سو گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔

میں جھاڑیوں کے اس طرح ہلنے پر کچھ حیران سا تھا۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے جوزف کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جوزف نے میرا اشارہ سمجھ لیا اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ جھاڑیوں میں ہلچل بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جانور جھاڑیوں کے اندر ہی

چلا تے درختوں کی شاخوں پر اچھل کود کر رہے تھے۔
چیتا اُس وقت دوبارہ دھاڑا اور ایک مرتبہ پھر بھینے کی طرف
بڑھنے لگا۔ اس موقع پر جوزف کی مہارت کام آئی اور اُس نے اپنی
رائفل سے چیتے پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ جوزف کی
فائرنگ نے چیتے پر کاری ضرب لگائی اور وہ گر کر غرائے لگا۔ ہم
دونوں بچان پر سے دم بخود ہو کر یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی
دیر بعد ہی چیتا دم توڑ گیا۔

ہم تقریباً آدھ گھنٹہ یونہی بیٹھے رہے۔ پھر میں نے اور جوزف
نے احتیاطاً چیتے کے جسم پر ایک ایک فائر اور کیا، لیکن چیتے کے جسم
میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ جوزف نے یہ دیکھ کر نعرہ لگایا اور ہم
آہستہ آہستہ درخت سے نیچے اترا آئے۔ وہ ایک صحت مند چیتا تھا۔
مجھے ابھی تک خطرناک چیتے کی ہلاکت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

پھر مردہ چیتے کی لاش جب روش شہر میں لائی گئی تو شہر میں
ایک جشن کا سا سماں تھا۔ لوگ خوشی کے گیت گارہے تھے اور مجھے
مبارک باد دے رہے تھے۔ آدم خور چیتے کے ہلاک ہونے سے
اردگرد کے علاقے میں کاروبار زندگی ایک مرتبہ پھر معمول کے
مطابق شروع ہو گیا اور میں نے اللہ تعالیٰ کا اس بات پر شکر یہ ادا
کیا کہ اُس کی دی ہوئی توفیق سے میں نے لوگوں کو اس درندے
سے نجات دلائی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ جھاڑیوں میں سے ایک
بڑی جسامت والے چیتے نے اپنا سر نکالا اور بھینے کی طرف دیکھ کر
غرائے لگا۔

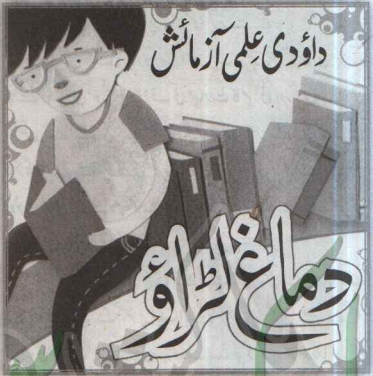
یہ وہی آدم خور چیتا تھا جس کا ہم دو دن سے انتظار کر رہے
تھے۔ وہ ہم سے بہ مشکل اٹھارہ بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ مجھے اس
لمحے کا انتظار تھا جب چیتا جھاڑیوں سے باہر آئے تو میں اس پر فائر
کروں۔ چیتے نے ہمیں خود یہ موقع فراہم کر دیا۔ اُس نے اپنے
پچھلے جسم کو سکپڑا اور اچھل کر درخت کی طرف جست لگائی۔ اُس
وقت بھینے کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ چلا تے ہوئے دائیں
بائیں بھاگتا تھا، لیکن رسی کی وجہ سے رُک جاتا تھا۔ میں اس لمحے
کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ جیسے ہی چیتا اچھلا میں نے نشانہ باندھ
کر فائر کیا۔ گولی چیتے کے اگلے دھڑ میں لگی اور وہ ہوا میں قلا بازی
کھا کر گر گیا فائر کی آواز سے اردگرد کے درختوں سے بے شمار
پرندے اڑے اور جنگل کی خاموش فضا میں بھونچال سا آگیا۔

چیتا زمین پر گرتے ہی اچھل کر دوبارہ اٹھا اور تیزی سے
بھینے کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے میں نے دوسرا فائر کیا جو چیتے کی
پچھلی ٹانگ میں لگا۔ یہ نشانہ بھی بالکل صحیح لگا اور چیتا ایک مرتبہ پھر
گر گیا، لیکن اس کے چند لمحوں بعد ہی وہ دوبارہ کھڑا ہو گیا۔
فائر کے دھماکوں سے جنگل میں شور مچا گیا۔ بندر چیتے

امثل باتیں

- ناکامی کا سیلاب کی پہلی بڑی سی ہے۔
- جو قوم اپنی تاریخ سے عبرت حاصل نہیں کرتیں، وہ تباہ ہو جاتی ہیں۔
- وقت کو ضائع نہ کرو، ورنہ وہ تمہیں ضائع کر دے گا۔
- جسے اپنے بار جانے کا ڈر ہوتا ہے وہ ضرور بار جاتا ہے۔
- گفتگو چاندی ہے اور خاموشی سونا۔
- صبر ایک ایسی ساری ہے جو اپنے سوا کو کبھی گرنے نہیں دیتی۔
- انسان کی قابلیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔
- جو شخص تعلیم کی مشکلیں نہیں جھیلتا، اسے ہمیشہ جہالت کی دلتیں جھیلنی
پڑتی ہیں۔
- کتابیں جوانی میں رہ نما، بڑھاپے میں تفریح اور تنہائی میں رفیق
ہوتی ہیں۔
- اچھا سلوک کرنا سونا اور چاندی دینے سے بہتر ہے۔
- مخلوق خدا کی خدمت ہی انسان کا سب سے بڑا کام ہے۔
- جس شخص کے پاس ہمت ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔
- سکھ حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو سکھ پہنچاؤ۔
- دنیا میں تمام چیزوں کی حد ہے، ہوائے علم کے۔
- جواب دینے میں جلدی نہ کریں، کہیں بعد میں پچھتا نا نہ پڑے۔
- (حافظ جواد السلم، بٹ، کوہبر انوالہ)

داؤدی علمی آزمائش



جوابات علمی آزمائش اپریل 2012ء

1۔ سورۃ الکوث 2۔ خالد غزوہ 3۔ احسن القصص 1792.4ء میں 5۔ سرگیری
سورہ 6۔ خان پور 7۔ چہ 8۔ بیس بال 9۔ آسٹون 10۔ قاری

اس ماہ بے شمار ساقیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3
ساقیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ علینہ کریم، میرپور (200 روپے کی کتب)

☆ اسد علی، ملتان (175 روپے کی کتب)

☆ محمد داؤد جان، راول پنڈی (125 روپے کی کتب)

دماغ لٹراؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی:

☆ ربیعہ اقبال، سید محبوب الرحمن، قمر ناز دہلوی، کراچی۔ نضر حیات،

جمہور۔ سلمان شاہ، محمد ابراہیم، محمد عبداللہ، قلب زہرہ مشہدی، عمارہ علی، عائشہ

مجیدہ انعم عارف، ماریہ جاوید چوہدری، نورائین، قراءۃ الیقین امین، محمد عدنان،

لاہور۔ ماریہ منیر، محمد عبداللہ، عثمان اقبال، عزیق شہزاد، نعمان ارشد، اسلام آباد۔

شہیر حسن، خوشاب۔ زین العابدین، لاہور۔ محمد اسد ملک، راول پنڈی۔

محمد اثمثار خان، گوجرانوالہ۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ سمنیل بابیش، گجرات۔ فزہ

عبدالرؤف، شمرین عبدالصمد، رحیم یار خان۔ تحریم آرش، بہاول پور۔ شاہ عالم

زمرہ، راول پنڈی۔ راجہ ثاقب حمود، جہلم۔ اسامہ اسلم، سرگودھا۔ تحریم اویس،

فیصل آباد۔ طہ لبتین، حیدر آباد۔ عائشہ ایمان، جہلم۔ حافظہ محمد سلیمان،

ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد عمر عطا قادری، کاموکی۔ کول صادق چوہدری، مومند

حمید، گوجرانوالہ۔ ایمان فاطمہ، راول پنڈی۔ محمد فیض الحسن، تلہ گنگ۔ کول

احمد، ملتان۔ سیما آصف، سانی وال۔ نقیہ نعت اللہ شاہ، قصور۔ فصیح

الرحمان صدیق، جوہر آباد۔ رابعہ لائق، حیدر آباد۔ حمزہ علی، راول پنڈی۔

محمد شتیق الرحمن اسلم، میرپور۔ محمد زبیر ارشد، ملتان۔ شانزہ مریم، نوشہرہ۔

ردا عدیل، لاہور۔ ذیشان اسماعیل، کالا ماٹ۔ جنید نعیم دیوان، جوہلی لکھا۔

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ کتنے وقت قریش کا نمائندہ کون تھا؟

آ۔ عمرو ہشام ب۔ سہیل بن عمرو ج۔ بدیل بن ورقہ

2۔ حضرت انسؓ کا کس پھل کا باغ حضور ﷺ کی دعا سے سال میں دو مرتبہ

پھل دیا کرتا تھا؟

ا۔ انگور ب۔ کھجور ج۔ کیلا

3۔ لفظ ”ہیونگ“ کے معنی کیا ہیں؟

ا۔ اڑان ب۔ دوستی ج۔ شریک سفر

4۔ موٹر سائیکل کے موٹر کا کیا نام ہے؟

ا۔ ایڈورڈ ڈیسلر ب۔ الفریڈ نوبل

5۔ ملکہ نور جہاں کا اصل نام کیا تھا؟

ا۔ مہر النساء ب۔ نور النساء ج۔ قمر النساء

6۔ کس شہر کو پاکستان کا دل کہا جاتا ہے؟

ا۔ پشاور ب۔ کراچی ج۔ لاہور

7۔ آغا خاں کشمیری کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ا۔ اداکاری ب۔ ڈرامہ نگاری ج۔ شاعری

8۔ معروف کھلاڑی مشتاق محمد کا تعلق کس کھیل سے تھا؟

ا۔ ہاکی ب۔ فٹ بال ج۔ کرکٹ

9۔ ”فارس“ کس ملک کا پرانا نام ہے؟

ا۔ ترکی ب۔ ایران ج۔ سعودی عرب

10۔ وائر پولو کی ٹیم میں کتنے کھلاڑی ہوتے ہیں؟

ا۔ سات ب۔ دس ج۔ چار

پزل کے ساتھ کوہن چپان کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2012ء ہے۔

دماغ لٹراؤ

نام:

مقام:

پتا:



میں ذرا اس طرف کے گاؤں کو سنبھالتی ہوں۔“

گولو گرین نے آدھے گھنٹے میں تمام گاؤں کو فارغ کر دیا۔

گوچی آئی نے گولو گرین کا شکریہ ادا کیا اور اسے ایک پھول انعام

میں دیا۔ گولو گرین خوشی خوشی آگے بڑھا تو آگے جا کر اُسے پیٹنگ

انگل نظر آئے۔ پیٹنگ انگل اپنے بیٹے پر پل موٹے کو ریاضی کی مشق

کرواتے ہوئے بری طرح ڈانٹ رہے تھے۔ گولو گرین وہاں پہنچا

تو پیٹنگ انگل سے پوچھا: ”انگل! میں آپ کی کچھ مدد کروں؟“

پیٹنگ انگل خوش ہو کر بولے: ”آؤ، آؤ گولو گرین! بیٹا یہ پر پل

موٹے کو ذرا ریاضی کی مشق کروادو۔ میں ذرا بازار سے جا کر کچھ

سامان لے آؤں۔“

گولو گرین نے مسکرا کر کہا: ”جی انگل میں کروا دیتا ہوں۔“

گولو گرین نے پر پل موٹے کو ریاضی کی مشق کروادی۔ پر پل

موٹے کی امی مز پیٹنگ نے گولو گرین کو گلاب جامن کھلائے۔ گولو

گرین نے آئی کا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔

چلتے چلتے گولو گرین بڑی سڑک کے کنارے پہنچا۔ وہ آگے

بڑھنے لگا تو اسے پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی: ”گولو گرین!“

وہ مڑا تو وہاں بھنڈی آئی کھڑی تھیں۔ وہ بھنڈی آئی کے

پاس آیا تو بھنڈی آئی بولیں: ”گولو بیٹا! مجھے اس ٹریفک سے بہت

ڈر لگتا ہے، مجھے سڑک تو پار کروادو۔“

مسٹر مز اور مسٹر مز کا ایک ہی بیٹا تھا، گول منول سا پورے کا

پورا گرین۔ اس کا نام مسٹر مز اور مسٹر مز نے ”گولو گرین“ رکھا۔ گولو

گرین بہت ہی پیارا سا تھا۔ ہر کوئی اُس سے پیار کیا کرتا تھا۔ وہ

تھا بھی پیار کے قابل۔ ہر کسی کا فرمانبردار اور ہر کسی کی مدد کرنے

والا۔ گولو گرین کو کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ وہ بہت نرم دل تھا۔

ایک دن مسٹر مز نے گولو گرین کو کہا: ”بیٹا! ذرا اپنے باغ سے

جا کر اسٹراہیریز تو توڑ لاؤ۔ میرا آج بہت دل چاہ رہا ہے کہ

اسٹراہیری کا جوس پیوں۔“

گولو گرین بولا: ”جی پاپا میں ابھی جا کر لے آتا ہوں۔ ویسے

بھی میں نے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا ہے اور ہنر بھی یاد کر لیا ہے،

میں ابھی جا کر باغ سے اسٹراہیریز توڑ لاتا ہوں۔“

گولو گرین گھر سے باہر نکلا تو راستے میں پھول گوچی آئی کی

پھولوں کی دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ

پھول گوچی آئی کی دکان میں بے پناہ رش تھا۔ گولو گرین فوراً آئی

کی دکان میں جا گھسا:

”آئی! میں آپ کی کچھ مدد کروں؟“

پھول گوچی آئی اُسے دیکھ کر کھل سی اٹھیں اور خوشدلی سے

بولیں:

”ہاں ہاں گولو گرین! آؤ، تم اُس کاؤنٹر کے گاؤں کو نمٹاؤ

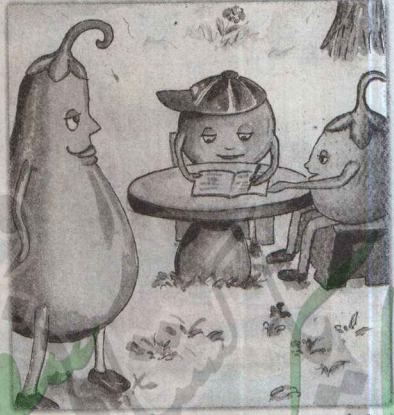
سے لٹ لے آئیں۔ گولو گرین نے ایک مرتبہ پھر بھنڈی آنٹی کو سڑک پار کروا کر دوسری جانب پہنچا دیا۔

دوسری طرف پہنچ کر اچانک آنٹی کو یاد آیا: ”اوہو، میں بھی کتنی بھلکو ہو گئی ہوں۔ اب لٹ کیسے پڑھوں گی؟ میں اپنا چشمہ تو گھر ہی بھول آئی ہوں۔ گولو بیٹا مجھے ایک مرتبہ پھر اس پار لے چلو۔“ گولو گرین نے ماتھے پر ایک بھی ٹھکن لائے بغیر بھنڈی آنٹی کی فرمائش پوری کر کے ان کو سڑک کے اُس پار پہنچا دیا۔ بھنڈی آنٹی تھوڑی دیر میں ہی گھر سے واپس آ گئیں۔ گولو گرین نے ان کو مسکرا کر دیکھا تو بھنڈی آنٹی شرمندہ ہوتے ہوئے بولیں:

”وہ بیٹا چشمہ تو میرے پرس میں ہی تھا۔“

گولو گرین مسکرا کر بولا: ”کوئی بات نہیں آنٹی! مگر آنٹی ٹوکری تو ہے نہیں آپ کے پاس، آپ سامان کیسے لے کر آئیں گی؟“ بھنڈی آنٹی سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں: ”ارے ہاں ٹوکری تو میں بھول ہی آئی بس ابھی لائی۔“

آنٹی ٹوکری لے کر آئیں۔ گولو گرین نے بہت ہی احتیاط سے وائیں بائیں دیکھتے ہوئے بھنڈی آنٹی کو سڑک پار کروادی۔ اس نے سگنل کے لال ہونے کا انتظار کیا اور جیسے ہی سگنل لال ہوا اس نے بھنڈی آنٹی کو ذہرا کرا سگ پر سے سڑک پار کروادی۔ بھنڈی آنٹی نے گولو گرین کا شکریہ ادا کیا اور سپر



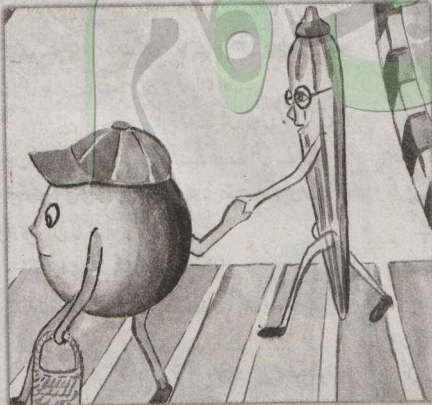
گولو گرین نے جھٹ بھنڈی آنٹی کا ہاتھ تھاما اور سڑک پار کروا دی۔ دوسری طرف پہنچ کر بھنڈی آنٹی اچانک اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں:

”ارے میں اپنا پرس تو گھر پر ہی بھول آئی، گولو بیٹا ذرا مجھے دوبارہ اس طرف لے چلنا۔“

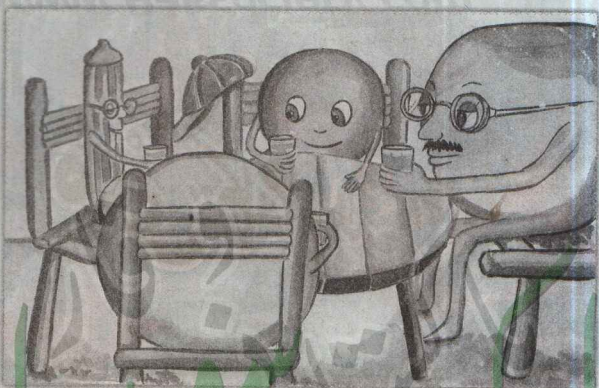
گولو گرین نے جھٹ سے بھنڈی آنٹی کا ہاتھ تھاما اور احتیاط سے سڑک پار کروا کر بھنڈی آنٹی کو دوسری طرف لے آیا۔ وہاں بھنڈی آنٹی نے گولو گرین کو رکنے کا کہا اور قریب ہی واقع اپنے گھر جا کر اپنا پرس لے آئیں۔ گولو گرین نے دوبارہ انہیں سڑک پار کروا کر دوسری طرف پہنچا دیا۔ ابھی وہ سڑک کے اُس پار پہنچے ہی تھے کہ بھنڈی آنٹی نے دوبارہ اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

”ارے گولو بیٹا! میں لٹ تو گھر ہی بھول آئی ہوں، بیٹا ذرا مجھے سڑک کے اُس پار لے چلو۔“

گولو گرین نے غصہ کئے بغیر مسکراتے ہوئے بھنڈی آنٹی کا ہاتھ تھاما اور تھوڑی ہی دیر میں احتیاط سے ان کو سڑک پار کروا کر دوسری جانب پہنچا دیا۔ بھنڈی آنٹی جھٹ سے جا کر اپنے گھر



دروازہ کھولا تو بھنڈی
آنٹی کھڑی تھیں۔ انہوں
نے مسکراتے ہوئے
سلام کیا اور گولو گرین کو
چاکلیٹ دی۔ پھر وہ
مسٹر مسٹر اور مسٹر مسٹر کو
مخاطب کرتے ہوئیں:
”آپ کا بیٹا گولو گرین
بے حد پیارا، بہت نیک
اور دوسروں کا ہم درد
ہے۔ اور اسے غصہ تو



بالکل بھی نہیں آتا۔ آپ لوگ بہت خوش قسمت ہیں جو آپ کا ایسا
بیٹا ہے۔“

پھر انہوں نے سارا واقعہ مسٹر مسٹر اور مسٹر کے گوش گزار
کیا۔ مسٹر مسٹر گولو گرین سے بے حد شرمندہ تھے کہ انہوں نے ناحق
اسے ڈانٹا۔ گولو گرین بولا:

”ماں باپ کی ڈانٹ تو خوش نصیبوں کو نصیب ہوتی ہے اور
میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ کی ڈانٹ نصیب ہوئی۔“
مسٹر مسٹر نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر گولو گرین کو نگلے
سے لگا لیا۔ مسٹر مسٹر اسٹریبری کا جوس بنا لائیں، مسٹر مسٹر اور مسٹر مسٹر
نے بھنڈی آنٹی کو بھی جوس پینے کے لئے روک لیا جس کی وجہ سے
وہ اپنے بیٹے کی خوبیوں کو جان پائے تھے۔ پھر سب نے مل کر
اسٹریبری کا مزے دار جوس پیا۔

مارکیٹ کی طرف چل پڑیں۔ گولو گرین واپس آیا اور سڑک پار کی
اور باغ کی طرف چل دیا۔ شام کے سائے گہرے ہو کر دن ڈھلنے
کا پتہ دے رہے تھے۔ گولو گرین نے جلدی جلدی باغ میں پہنچ کر
اسٹریبریز توڑیں اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گولو گرین گھر پہنچا تو
رات کافی گہری ہو چکی تھی۔

گولو گرین گھر پہنچا تو مسٹر مسٹر بہت غصے میں تھے۔ انہوں
نے گولو گرین کو خوب ڈانٹا: ”یہ وقت ہے تمہارے گھر آنے کا؟
میں نے تمہیں اسٹریبریز لانے کے لیے بھیجا تھا، تم لا پرواہ ہوتے جا
رہے ہو۔“

گولو گرین سر جھکائے سنتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا: ”آئی ایم
سوری پاپا۔ مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ کبھی اتنی دیر نہیں لگاؤں گا۔“
ابھی یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ دروازہ بج۔ مسٹر نے

احساس

مامون عباسی کے زمانے میں ناپ تول میں کمی کرنے والے تاجروں کو پچاس کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ اس نے جلا دو ایک ہزار درہم رشوت دے کر کہا
کہ وہ کوڑے اس کے بدن پر مارنے کی بجائے زمین پر مارے۔ جلا دے 49 کوڑے زمین پر مارنے کے بعد آخری کوڑا پوری قوت سے تاجر پر دے
مارا۔ اس کو شدید تکلیف ہوئی تو اس نے جلا دے کہا: ”میں نے تجھے محض اس لیے رشوت دی تھی کہ مجھے کوڑے نہ لگنا تاکہ مجھے تکلیف نہ ہو آخر تو نے
مجھے ایک کوڑا کیوں مارا؟“

(ماہو خواجہ، چشمہ)

”میں تمہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ اس لین دین میں تم فائدے میں رہے ہو۔“ جلا دے جواب دیا۔

مئی کا مہینہ

موسم بدلا رُت بھی بدلی ، بدل گئے انداز
مئی مہینہ دھوپ کی شدت گرمی کا آغاز

ٹھنڈی ٹھنڈی چیزیں کھاؤ ، پچکھے خوب چلاؤ
راتیں چھوٹی ، دن ہیں لمبے، دن کو بھی سو جاؤ

سرسوں پھولی ، فصلیں پک گئیں ، پیلے ہو گئے پات
خربوڑے ، تربوز کی آمد ، آموں کی بہتات

دودھ اور دلیا لسی شربت اور شربت انجیر
کھیرے، پیاز، ٹماٹر کھاؤ، ستو ہے اکسیر

پتلے پتلے کپڑے پہنو کم کم دھوپ میں جاؤ
مکھن ہو تو مری میں جا کر پکنک خوب مناؤ

دھوپ سے بچنا پیارے بچو رہنا ٹھنڈی چھاؤں
ایک ہی جیسی اس کی شدت شہر میں ہو یا گاؤں

کرامت بخاری

اکسیر: نہایت مفید



محمد فہیم عالم

”ہائے..... ہائے۔ اوہ..... آف خدا کتنا درد ہو رہا ہے۔
ارے جن ماش ذرا دھیرے، دھیرے کر..... آ..... وہ.....“
چچا تیز گام بری طرح راہ رہے تھے۔
”مالک! میں تو پہلے ہی ماش بہت آہستہ آہستہ کر رہا ہوں۔“
جن بولا۔

”مذاق کر رہے ہو ہم سے، ہائے کر لو..... کر لو جتنا مذاق کرنا
ہے، جب ہم مرجائیں گے تب دیکھیں گے تم کس سے مذاق
کرتے ہو۔“ چچا تیز گام آہ بھرتے ہوئے بولے۔
”مالک! ب..... بھلا میری اتنی جرات کہاں جو یہ گستاخی
کروں۔“ جن گھبرا گیا۔ ”اور ہاں..... میں آپ کے دشمن، خدا
میری عمر بھی آپ کو لگا دے۔.....“ جن دُعا نین دیتے ہوئے
بولا۔

آج ہوا دراصل یہ تھا کہ چچا تیز گام صبح تیزی سے سیر ہیاں
اُترتے ہوئے گر گئے تھے۔ بیگم نے نئی مرتبہ چچا تیز گام کو متنبہ بھی کیا
تھا کہ آپ اتنی تیزی سے سیر ہیاں مت اترا کریں خدا نہ کرے اگر
آپ گر گئے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے۔
”لو بیگم! تم بھی کمال کرتی ہو۔ ہم اتنے بھی گزرے نہیں
ہیں کہ سیر ہوں سے گر جائیں۔ اب بھلا آہستہ آہستہ سیر ہیاں

محلے میں پھیلا دی۔ سب سے پہلے چچا تیزگام کے پرہیز خالو شہزادی آ گئے۔ ”تیزگام! کیا تم نے دودھ میں ہلدی ملا کر پی ہے؟“ خالو شہزادی نے آتے ہی سوال کیا۔ ”ابھی تک تو کچھ بھی نہیں پیا۔ پیتے کیسے مارے درد کے ہماری



جان نکلی جا رہی ہے۔“ چچا تیزگام بولے۔

”تو پھر جلدی سے دو تین گلو دودھ میں ہلدی ملا کر پیو۔“ خالو شہزادی بولے۔

”اس سے کیا ہوگا؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا، جمن جلدی سے دودھ گرم کر کے لاؤ۔ اور ہاں! دودھ میری دکان سے لاتا۔ بڑا خالص دودھ آیا ہوا ہے آج۔“ خالو شہزادی بولے۔ کچھ دیر بعد جمن گرم گرم دودھ میں ہلدی ملا کر لے آیا۔ چچا تیزگام نے ابھی دودھ کے دو تین گھونٹ ہی پیئے تھے کہ انہیں ابکائی آنے لگی۔

”بس!..... بھئی اب ہم سے اور دودھ نہیں پیا جاتا۔.....“

چچا تیزگام بولے۔

”ارے کیوں نہیں پیا جاتا، یہ ہلدی ملا دودھ تمہاری چوٹ

سے درد کو کھینچ لے گا، یہ سارا دودھ تم نے پینا ہے۔“

”اچھا پھر تو ہم ضرور یہ دودھ پییں گے۔“

”لاؤ جمن! جگ ہی ہمیں پکڑا دو۔“ چچا تیزگام بولے۔

پھر وہ جگ کو منہ لگا کر چند منٹوں ہی میں سارا دودھ پی گئے۔

”تیزگام یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے

اور تم نے اسے یوں پیچوڑا ہوا ہے۔“

چچا تیزگام ابھی منچوں پر لگی بالائی اور ہلدی کو صاف کر ہی

”کہیں کیا، بولا تم چپ کیوں ہو گئے؟“

”مالک! کہیں ایسا تو نہیں آپ کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی

ہو۔.....“

”اوہ..... ہاں..... واقعی..... ضرور ہمارے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ

گئی ہے۔ جی تو ہمیں اتنا درد ہو رہا ہے۔ ہائے اللہ..... میرا گھٹنا

ٹوٹ گیا۔ اب میں کس طرح چلا کروں گا۔ اپنے دوستوں پہلوان

جی اور گلو میاں کے پاس کس طرح جایا کروں گا۔ جمن، استاد، جاؤ

تمام محلے والوں کو بتاؤ کہ ہمارا کہا سنا معاف کر دیں۔ اور آخری

مرتبیل جائیں۔ ٹانگ ٹوٹنے کے بعد بھلا ہم کیسے زندہ رہیں گے۔“

چچا تیزگام زور زور سے واہیلا کرتے ہوئے بولے۔ جمن اور

استاد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازے کا رخ کیا۔

”آپ بھی بات کا ٹنگڑ بنا لیتے ہیں۔ بھلا اس معمولی سی

چوٹ کے لیے محلے والوں کو بلانے کی کیا ضرورت ہے۔“

بیگم جھنجھلا کر بولیں۔

”بیگم! تمہیں یہ چوٹ معمولی نظر آرہی ہے۔ اور ہم ہیں کہ

درد سے مرے جا رہے ہیں۔ اگر تمہیں چوٹ لگتی تو تمہیں پتہ

چلتا۔.....“ چچا تیزگام فوراً بولے۔

”اللہ نہ کرے کہ میں میزبھیوں سے گرتی۔“ بیگم فوراً بولیں۔

چچا تیزگام کی ٹانگ ٹوٹنے کی خبر جمن اور استاد نے پورے

رہے تھے کہ گلو میاں کرے میں داخل ہوتے ہی بولے۔

”تو کیا مجھے اپنی ٹانگ باندھ کر رکھنی چاہیے؟“

چچا تیز گام نے حیرت سے پوچھا۔

”اور نہیں تو کیا!..... چلو میرے ساتھ۔ تمہاری ٹانگ پر پلستر

لگوانے چلتے ہیں، میرا بھانجا ڈاکٹر ہے۔ آخر وہ کس دن کام آئے

گا۔“ گلو میاں بولے۔

چچا تیز گام تو گویا پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ پھر گلو میاں

چچا تیز گام کو اپنے بھانجے ڈاکٹر عمران کے پاس لے گئے۔ ان کے

بھانجے ڈاکٹر عمران نے بہت کہا کہ پہلے ایکس راکرا کے چیک کر

لیتے ہیں کہ ٹانگ ٹوٹی بھی ہے کہ نہیں، لیکن چچا تیز گام کی ایک ہی

رٹ تھی کہ ایکس رے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چچا تیز گام نے اپنی

ٹانگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ دیکھو! یہ جو بڑی اُبھری ہوئی ہے۔ دراصل یہ ٹوٹی ہوئی

بڑی ہے۔“ ڈاکٹر عمران نے بے بسی سے کندھے اچکائے اور پلستر

لگانے لگے۔

پلستر لگنے کے بعد گلو میاں چچا تیز گام کو گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ چچا تیز گام کے دوست حکیم تاج الدین

چلے آئے۔

”بھئی تیز گام بڑا افسوس ہوا تمہاری ٹانگ کا سن کر، اللہ تعالیٰ

تمہیں ایک ہی ٹانگ پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ارے یہ

کیا! حکیم صاحب اچانک چلا اٹھے۔

”ارے تیز گام! تم نے اپنی ٹانگ پر پلستر باندھا ہوا ہے اور وہ

بھی ہمارے ہوتے ہوئے، نہیں، ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

جن، استاد ہمارے دوست کی ٹانگ سے پلستر اتار دو۔ اگر ہم بروقت

نہ آتے تو ہمارے دوست کی ٹانگ تو گئی تھی۔ ارے بھئی یہ پلستر تو

ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے لیے زہر قاتل ہے۔ اس سے تو تمہاری ٹانگ

لٹھی کی طرح اکڑ کر رہ جائے گی۔“ حکیم صاحب بولتے چلے گئے۔

”ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا۔ ارے تم دونوں ہمارا منہ کیا دیکھ

رہے ہو، اتارو اس کم بخت پلستر کو۔ اس سے تو واقعی ہماری ٹانگ

اکڑ کر رہ گئی ہے۔“ چچا تیز گام بولے۔ پھر جن اور استاد پلستر

اتارنے لگے۔

”جن! اب تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک تیل دوں گا۔

جو میں نے برسوں کی محنت سے مختلف جڑی بوٹیوں ملا کر تیار کیا

ہے۔ اُس کی مالش ہمارے دوست تیز گام کو کر دینا۔ پھر دیکھنا اُس

تیل کا کمال۔ پلک جھپکنے میں ٹوٹی ہوئی بڑی کو جوڑ دے گا۔“

پلستر اتر چکا تو حکیم صاحب بولے۔

جن اس وقت اُسی تیل کی مالش چچا تیز گام کی ٹانگ پر کر رہا

تھا۔ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ چچا تیز گام ہر روز عصر کی نماز

کے بعد گپ شپ لگانے اپنے دوست پہلوان جی کے پاس جاتے

تھے۔ آج وہ ٹانگ ٹوٹنے کی وجہ سے نہ جا سکے تھے۔ کچھ دیر تک

پہلوان جی اُن کا انتظار کرتے رہے۔ پھر خود ہی وہ چچا تیز گام کے

گھر آ گئے۔

”واہ..... بھئی واہ۔ تیز گام، بہت خوب! میں گھر میں تمہارا

انتظار کر رہا ہوں۔ اور تم یہاں مزے سے ٹانگیں دیوا رہے ہو۔“

پہلوان جی شکوہ بھرے لہجے میں بولے۔

”آہ..... واہ..... پہلوان جی۔ مزے سے کہاں، درد سے بے

حال ہوں، آج صبح میزبھوں سے اُترتے ہوئے میری ٹانگ ٹوٹ گئی

ہے۔“ پھر چچا تیز گام نے اپنی داستان ٹانگ پہلوان جی کو سنا دی۔

”اگر یہ بات سچی تو مجھے بلا لیا ہوتا۔ بڑی جوڑنا تو، ہمارا

خاندانی پیشہ ہے۔ لاؤ دکھاؤ ذرا.....“ پہلوان جی بولے۔ چچا

تیز گام نے کھٹا انہیں دکھایا۔ پہلوان جی غور سے گھسنے کا معائنہ

کرنے لگے۔

”یار تیز گام! کبھی تو اپنی تیزیاں چھوڑ دیا کرو، یہ بڑی کوئی

ٹوٹی ہے۔ یہ تو صرف سوجن ہے۔ جو گرنے سے آ گئی ہے۔ اور تم

یوں ہی اپنی ٹانگ توڑے بیٹھے ہو۔“ پہلوان جی بولے۔

”کیا ہماری ٹانگ نہیں ٹوٹی، یا اللہ تیرا شکر ہے۔ میری ٹانگ

ٹوٹنے سے فح گئی۔ بیگم..... بیگم یہ دیکھو، ہماری ٹانگ بالکل ٹھیک

ہے۔“ چچا تیز گام مارے خوشی کے بیڈ سے نیچے کود پڑے۔ اور

اچھلتے ہوئے بولے۔ چچا تیز گام کو خوش دیکھ کر سب گھر والے بھی

خوش ہو گئے تھے۔

ٹرینک کے اشارے



ٹرینک کے ہم ہیں عزیزو اشارے
محافظ ہیں ہم سب اشارے تمہارے

☆

ہوا سامنے سرخ دیکھو اشارہ
اشارہ ہے گاڑی کو یہ روکنے کا

☆

جونہی دیکھو پیلے کلر کا اشارہ
گرین ہو گا فوراً ہی اگلا اشارہ

☆

اشارہ ہرے رنگ کا جس گھڑی ہو
تو پھل چل پڑو آگے میرے عزیزو

☆

نظر آئے میرا اشارہ جو تم کو
کھڑی کرنا گاڑی وہاں پر نہ دیکھو

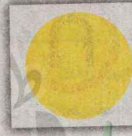
☆

مرا کام ہے بس یہ تم کو بتانا
کہ ہارن کسی قسم کا مت بجانا

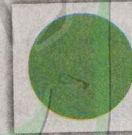
☆



سرخ
اشارہ



پیلا
اشارہ



سبز
اشارہ



گاڑی
کھڑی کرنا
منع ہے



ہارن
بجانا
منع ہے

اپنی
رفتار کم
کر لیجیے



سڑک پر نشاں میرا جب دیکھیے گا
تو رفتار کم اپنی کر لیجیے گا
☆

سڑک
بند
ہے



سڑک بند ہے ، میں اشارہ ہوں اس کا
مجھے دیکھ کر اُس طرف پھر نہ بڑھنا
☆

داخلہ
ممنوع
ہے



اشارہ مرا دیکھ کر یہ سمجھ لو
کہ ہے منع یاں داخلہ اے عزیزو
☆

یہاں سے
واپس مڑ
سکتے ہیں



عمیاں ہے نشاں سے یہ اک بات پیارے
کہ مڑ سکتے واپس ہو تم سب یہاں سے
☆

موٹر سائیکل
کا داخلہ
ممنوع ہے



مجھے دیکھ کر تم نہ پھر آگے بڑھنا
کہ ہے داخلہ بند بائیک کا بھیتا
☆

حد رفتار
پچاس کلومیٹر



بھگاؤ نہ تیزی سے گاڑی کو دیکھو
جو رفتار کی حد ہے اپناؤ اُس کو
☆



ٹریفک قواعد کو رکھو نظر میں
پریشانی ہو گی نہ کوئی سفر میں
☆
فضاء الحسن ضیا

درخت



ہارون اشرف

ایک چھوٹی سی محراب سے گزر کر اس ویران اور تباہ حال مقبرے میں داخل ہوئے۔ نہ کوئی درخت تھا نہ باغ۔ یہ عمارت یقیناً کسی دور میں بے حد خوب صورت رہی ہوگی، مگر اب معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر کسی نے بم برسائے ہوں۔ جگہ جگہ سے انٹیلنگی ہوئی تھیں۔ پلستر اکھڑا ہوا تھا اور گنبد کے پتھر نظر آرہے تھے۔

”بچو! جانتے ہو اس عمارت میں کون دفن ہے؟“ منیر صاحب نے پوچھا۔ کسی بچے کو معلوم نہیں تھا کہ اس عمارت میں کون دفن ہے۔

”بیٹے! یہ آصف خان کا مقبرہ ہے۔ یہ وہ شخص تھا کہ ہندوستان کے عظیم شہنشاہ جہانگیر اور شاہ جہاں اہم فیصلے کرنے سے پہلے اس سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس کی بہن نور جہاں، جہانگیر کی ملکہ تھی اور بیٹی ممتاز محل، شاہ جہاں کی بیوی تھی جس کی قبر پر عظیم الشان یادگار تاج محل تعمیر ہوئی۔ وسیع مغلیہ سلطنت کی ساری فوجیں اس کے حکم کی منتظر رہتی تھیں۔ شاہی خاندان کے بعد یہ شخص ملک میں سب سے زیادہ طاقت ور تھا اور بے انتہا دولت کا مالک تھا۔“ بچے بہت توجہ سے منیر صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ ”مگر اس ساری دولت اور طاقت کا کیا فائدہ کہ جب وہ مرا تو اسے صرف ایک کفن نصیب ہوا جیسے ہر انسان کو ہوتا ہے

سکول کے بچے مقبرہ جہانگیر کی سیر کو آئے ہوئے تھے۔ سب نے پہلی مرتبہ اس تاریخی عمارت کو دیکھا تھا۔

ٹوٹی چھوٹی سڑک کے آخر میں مغلیہ طرز کا ایک خوب صورت مگر شکستہ حال دروازہ تھا۔ اس کے اندر ایک باغ تھا جس کے بائیں طرف پرانی سی مسجد تھی اور دائیں طرف ایک اور دروازہ تھا۔ اس دروازے سے اندر جائیں تو سامنے مقبرہ جہانگیر کی حسین محرابوں اور بلند و بالا خوب صورت میناروں والی عمارت تھی جس کے ارد گرد ایک بہت وسیع باغ ہے۔ جب لڑکے خوش تھے کہ انہیں ایک ساتھ سیر کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ہنسی مذاق کرتے گھوم پھر رہے تھے۔ ان کے استاد منیر صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب وہ مقبرے سے سیر کر کے نکلے تو انہیں باغ کی مسجد کے پیچھے ایک ویران سا گنبد نظر آیا۔

طلحہ نے منیر صاحب سے کہا:

”سر دیکھیں وہ بھی ایک عمارت ہے۔“

”ہاں بیٹے! یہ ایک اور مقبرہ ہے۔“

”تو چلیں وہ بھی دیکھ آتے ہیں۔“

”ہاں چلتے ہیں۔“

تھوڑی دیر میں سب بچے اور منیر صاحب مسجد کے پہلو میں

چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ آج وہ یہاں دفن ہے اور اس کے مقبرے کی کتنی بڑی حالت ہے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی میں تو کبھی اس نے یہ سوچا بھی نہ ہوگا۔ اچھا! اب کون بتائے گا کہ اس سارے قصے میں کیا نصیحت ہے؟“

”میں!“ علی نے ہاتھ لہرا دیا

”شاباش! بتاؤ علی۔“

”کہ ہمیں جلدی سے اس ویران مقبرے سے بھاگ نکلنا چاہیے۔“

سب بچے ہلکھلا کر ہنس پڑے۔ منیر صاحب سے بھی ہنسی قابو کرنا مشکل ہو گئی۔

”اچھا بھئی! ہنسی مذاق بہت ہو گیا۔ اب سنجیدہ ہو جاؤ۔ ہاں! تو کون بتائے گا؟“

”میں بتاؤں گا سر!“ حسن نے ہاتھ کھڑا کیا۔

”ہاں بتاؤ۔“

”انسان کو ضرورت سے زیادہ دولت اکٹھی نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ موت کو یاد رکھنا چاہیے۔“

”شاباش! بہت خوب! انسان کو دنیا میں دولت کمانے سے زیادہ نیک کام کرنے چاہئیں۔“

وہ سب مقبرے میں داخل ہوئے۔ ہر طرف ٹوٹ پھوٹ اور شگستگی نظر آ رہی تھی۔ قبر کے کتبے کے سامنے ایک مالی اپنی درختی ساتھ رکھے لمبی تان کر سوراہا تھا۔ بچے اُسے دیکھ کر ہنسنے لگے مگر اس کی نیند نہیں ٹوٹی۔ دوسری طرف قبر کے ایک لگا کر ایک طالب علم سکول یونیفارم میں بیٹھا ادھڑا رہا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سکول سے بھاگ کر آیا ہے۔ انہیں دیکھ کر وہ لڑکا شرمندہ ہوا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

اویس اور عدنان کی نظر مقبرے کی دیواروں پر پڑی۔ وہاں جابجا لوگوں کے نام اور تاریخیں لکھی ہوئی تھیں۔ عدنان نے جب سے کالا مار کر نکالا اور پھر دونوں ایک طرف ہو کر دیوار پر اپنا نام لکھنے لگے۔ ابھی وہ مقبرے ہی میں تھے کہ انہیں ایک خاتون اور ایک آدمی اندر آتے نظر آئے۔ آدمی کے ہاتھ میں

پینٹ کے ڈبے تھے۔ خاتون نے مقبرے میں آکر بڑی دل چسپی سے بچوں کو دیکھا اور پھر منیر صاحب سے بات چیت کرنے لگیں۔ انہوں نے منیر صاحب سے اجازت لی کہ وہ بچوں سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔

”پیارے بچو! مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ عظیم تاریخی یادگار کو دیکھنے آئے ہیں۔ یہی یادگاریں ایک قوم کی پہچان ہوتی ہیں اور گزرنے والی یاد دلاتی ہیں۔ جن بادشاہوں اور دولت مندوں نے یہ عمارت بنوائیں انہوں نے تو صرف دولت لگائی ہے۔ اصل محنت تو اُن فن کاروں کی ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی ان عمارتوں کو شاہکار بنانے میں لگا دیں۔ ہمیں ان کی محنت ضائع نہیں ہونے دینی چاہیے۔ دیکھیں کتنے ڈھک کی بات ہے۔ ہر تاریخی عمارت کی طرح اس عمارت کی دیواروں پر بھی لوگوں نے اپنے نام لکھ کر اسے تباہ کر دیا ہے۔ آج میں یہ پینٹ کے ڈبے لائی ہوں تاکہ ان دیواروں پر رنگ کر دوں اور اس عمارت کی حالت کچھ بہتر ہو۔ اگر آپ چاہیں تو میری مدد کر سکتے ہیں اس طرح کام جلدی ختم ہو جائے گا۔“

منیر صاحب بول اُٹھے۔ ”آپ کا جذبہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ سب طالب علم بہت اچھے ہیں۔ آپ کی مدد ضرور کریں گے۔“

تین لڑکوں نے ایک دیوار کو پینٹ کرنے کا ذمہ لے لیا۔ خاتون اور منیر صاحب بھی اس کام میں لگے ہوئے تھے۔

”آپ کے شاگرد تو واقعی بہت اچھے اور محنتی ہیں، میں تو سوچ رہی تھی کہ آج مجھ سے یہ کام ختم نہیں ہوگا۔“ خاتون خوشی سے لڑکوں کو پینٹ کرتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

مقبرے کی حالت بہت بہتر لگ رہی تھی۔ عدنان نے پینٹ کرتے کرتے دیوار کے اس حصے پر نظر ڈالی جہاں کچھ دلیر پہلے اس نے اپنا اور اویس کا نام لکھا تھا۔ اس نے پینٹ کا ڈبہ اٹھایا اور اپنے نام پر جلدی جلدی رنگ پھیر دیا۔

پیارے بچو! آپ بھی جب کبھی کسی تاریخی عمارت کی سیر کو جائیں تو ہر گز اپنا نام اس کی دیواروں پر نہ لکھیں۔ یہ بات اپنے دوستوں کو بھی بتائیں۔

میری زندگی کے مقاصد



محمد حسین بکراچی
میں پانٹ بن کر ملک و قوم کی
خدمت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد حسین بکراچی
میں پانٹ بن کر ملک و قوم کی
خدمت کرنا چاہتا ہوں۔



فاخرہ ارشد اسلام آباد
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے
والدین کا نام روشن کروں گی۔



فاخرہ ارشد اسلام آباد
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے
والدین کا نام روشن کروں گی۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



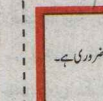
محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



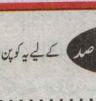
محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔



محمد یونس شیرازی بہتان
میں پاک آری میں جا کر پاکستان کی
حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔

میری زندگی کے مقاصد
کے لیے یہ کہیں پر کا اور پاسپورٹ سائز تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
نام
مقاصد
شہر



سے یہ نام دیا گیا ہے۔
گینڈا

خسکی پر رہنے والے بھاری بھرکم جانوروں میں گینڈا RHINOCEROS بھی شامل ہے۔ جن کا وزن ایک ٹن تک ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ان کا وزن زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس جانور کا تعلق RHINOCEROTIDAE خاندان سے ہے۔ گینڈے کی 5 اقسام ہیں۔ جن میں سے دو اقسام افریقہ اور تین انواع جنوبی ایشیاء میں پائی جاتی ہیں۔ افریقی گینڈے کے دو جب کہ ایشین گینڈے کا ایک سپیک ہوتا ہے۔ یہ سینگ KEARTIN پروٹین کا بنا ہوتا ہے۔ گینڈا ایک وزنی اور سبزہ کھانے والا جانور ہے۔ اس کی جلد 1.5 سے 5 سینٹی میٹر تک موٹی ہوتی ہے۔ افریقی گینڈے کے سامنے کے دانت نہیں ہوتے۔ افریقی گینڈوں کا وزن 3500 کلو گرام (7700 پاؤنڈ) سے 600 کلو گرام (3500 پاؤنڈ) تک ہوتا ہے۔ جب کہ ان کی لمبائی 3.5 سے 4



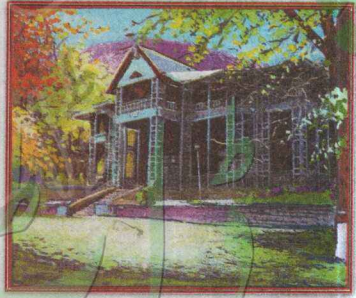
میٹر (11 سے 15 فٹ) یا 3.5 سے 3.9 میٹر (11 سے 13 فٹ) ہوتی ہے۔ ایشیاء کے گینڈوں کا وزن 2500 سے 3200 کلو گرام (5500 سے 7100 پاؤنڈ) تک ہوتا ہے۔ گینڈے کو شکار کرنے والوں میں انسان، مگر چھ، جنگلی بلیاں اور جنگلی کتے شامل ہیں۔ گینڈے کی نسل کو سب سے زیادہ خطرہ انسانوں سے ہے۔ اسی لیے 1989ء میں فلوریڈا میں انٹرنیشنل رینو فاؤنڈیشن قائم کی گئی ہے۔

ڈرون

یوں تو شہد کی زکھی کو ڈرون کہا جاتا ہے، لیکن آج کی دنیا



صوبہ بلوچستان کے خوب صورت اور پُر فضا مقامات میں زیارت کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ علاقہ جولائی 1986ء میں بنایا گیا پاکستان قائد اعظم نے زندگی کے آخری ایام اسی شہر میں گزارے تھے۔ یہ علاقہ زلزلے کی فالٹ لائن پر موجود ہے۔ 29 اکتوبر 2006ء میں یہاں شدید زلزلہ بھی آیا تھا۔ اس شہر میں



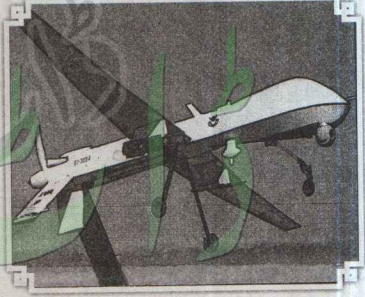
99 فی صد مسلمان رہتے ہیں۔ زیارت کے بلند ترین پہاڑ کو خلافت حل کہتے ہیں۔ یہ علاقہ سطح سمندر سے 2700 میٹر بلند ہے۔ یہاں کی آب و ہوا آلودگی سے پاک ہے۔ اسی لیے 1892ء میں یہاں لکڑی کی مدد سے ایک رہائش گاہ بنائی گئی جس میں 1948ء میں قائد اعظم ٹھہرے تھے۔ زیارت کے علاقے میں دنیا کا دوسرا بڑا "JUNIPER FOREST" ہے۔ سرو کے یہ درخت 247000 ایکڑ پر پھیلے ہیں۔ زیارت میں گرمیوں میں چیری اور سردیوں میں سیب بکثرت ملتے ہیں۔ زیارت کو ایک بزرگ KHARWARI جن کا اصل نام طاہر تھا کے مزار کی وجہ

ہوائی چکی

دُنیا بھر میں توانائی کے نئے ذرائع تلاش کیے جا رہے ہیں۔ جن میں سے ہوا سے بجلی بنانا بھی شامل ہے۔ ونڈ میل (WIND MILL) یا ہوائی چکی ایسی مشین ہے جو ہوا کی مدد سے توانائی کی روٹیشنل (ROTATIONAL) انرجی میں تبدیل کرتی ہے۔ ہوائی چکی کے بڑے بڑے پتھرے یا کپڑے ہیں جنہیں "SAILS" کہا جاتا ہے۔ ہوائی چکی سے آٹا پسا جاتا ہے۔ یہ صنعت کا پھیلہ گھاتی ہیں۔ پانی پمپ کرتی اور بجلی پیدا کرنے کا کام کرتی ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کے لیے ٹرہائن استعمال ہوتی ہے۔ ہوا کی وجہ سے پتھرے تیزی سے چلتے ہیں جو ٹرہائن کو گھما کر بجلی پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ہوا سے بجلی پیدا کرنے والے ممالک میں چین، امریکہ، جرمنی، اسپین اور بھارت ٹاپ پر ہیں۔ ان کے علاوہ اٹلی، فرانس، برطانیہ، گینیزا اور ڈنمارک بھی ہوائی چکی سے بجلی پیدا کر رہے ہیں۔ ایک ہوائی چکی 25 سے 30 سال تک کام کرتی ہے۔ پاکستان میں پہلی ہوائی چکی صوبہ سندھ کے علاقے ٹھٹھہ میں



میں ڈرون جاسوس طیارے کا تذکرہ ہر طرف ملتا ہے۔ اس طیارے کو عموماً بغیر پائلٹ کے اڑایا جاتا ہے اسی لیے تکنیکی طور پر ڈرون کو UN MANNED AERIAL VEHICLES کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء 22 اگست 1849ء کا وہ ریموٹ کنٹرول جہاز تھا جب آسٹریا نے اٹلی پر حملہ کیا اور بعد ازاں اس جہاز کا جاسوسی اور جنگی مقاصد کے لیے استعمال شروع ہوا۔ آج امریکہ، روس، چین، اسرائیل اور ایران کے پاس ڈرونز طیارے موجود ہیں۔ جب کہ پاکستان اور بھارت اس کی تیاری کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ یہ طیارے وزن میں ہلکے اور دُور بیٹھ کر کمپیوٹر سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ امریکی فوج صرف 700 گرام وزنی ڈرون طیارہ استعمال کرتی ہے۔ جس کا نام "سنو کا پٹر" ہے۔ ڈرون ایک نظام کا نام ہے۔ جس میں 4 طیارے، زمینی کنٹرول اسٹیشن اور اُس کا سٹیلٹس سے رابطہ ہے۔ 1960ء میں امریکہ میں ان طیاروں کی باضابطہ نمائش بھی ہوئی تھی جو ڈرونز ویت نام کے خلاف استعمال



19 اپریل 2009ء سے نصب ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ میں سوات کے علاقے میں بھی ہوائی چکی لگائی جا رہی ہے۔ 2010ء میں دُنیا میں سب سے زیادہ ہوائی چکی سے بجلی بنانے کا اعزاز جرمنی کو حاصل ہوا ہے۔ پاکستان کے صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں آتی ہوا چلتی ہے کہ ہوائی چکی کی مدد سے سالانہ 3 لاکھ 50 ہزار میگا واٹ بجلی بنائی جا سکتی ہے۔

☆☆☆

ہوئے تھے۔ یہ طیارے 36 فٹ لمبے اور ان کے پروں کا پھیلاؤ 24 فٹ تھا۔ یہ طیارے اب تک ویت نام، لبنان، افغانستان اور پاکستان سمیت کئی مقامات پر تباہی پھیلا چکے ہیں۔ امریکہ نے ڈرون کا نیا ماڈل ڈرون A-160 بنایا ہے جو بغیر رن وے کے اڑتا ہے اور 20 ہزار فٹ کی بلندی سے 168 مربع کلومیٹر کی جاسوسی کر سکتا ہے۔



آئیے مسکائیے

رہے تھے؟

طالب علم: ”سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں تو نیند میں باتیں نہیں کرتا۔“
(عمر فاروق، گوجرانوالہ)

چکن

ایک دفعہ ایک آدمی اپنی مرغی کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ایک لقمہ خود کھاتا اور ایک مرغی کو کھلاتا۔ اُس کو ایسا کرتے دیکھ کر ایک دوست نے پوچھا:

”تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟“

آدمی: ”میں خاندانی امیر ہیں روزانہ چکن کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔“
(سید فاروق محی الدین، لاہور)

خالی بس

پہلا دوست (دوسرے دوست سے): ”یہ تمہارے سر پر چوٹ کیسے لگی؟“

دوسرا دوست: ”یار! میں بس میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ گاڑی کے ہچکولے کھانے سے میرا سر بس کی چپت سے ٹکرا جاتا تھا اور اسی طرح میرا سر ڈٹی ہو گیا۔“

پہلا دوست: ”تو تم اپنی سیٹ بدل لیتے۔“

دوسرا دوست: ”یار! کس کے ساتھ سیٹ بدلنا! ساری بس تو خالی تھی۔“
(ہاراجدلی عاجز، منڈی فیض آباد)

گاڑی

ان پڑھ شخص (ایشن ماسٹر سے): ”یاؤ جی! 3 بجے والی گاڑی کب آئے گی؟“

ایشن ماسٹر (مکراتے ہوئے): ”دو بج کر ساٹھ منٹ پر۔“

ان پڑھ شخص: ”میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ گاڑی کا وقت بدل گیا ہے۔“
(سعد علی، سرگودھا)

شکر

استاد: ”کیا تم رات کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے سوتے ہو؟“
شاگرد: ”میں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہی ہوں میری امی بھی شکر ادا کرتی ہیں کہ یا اللہ حیران شکر ہے کہ مٹا سو گیا ہے۔“

(اقراء بشیر بھوکہ، واہ کینٹ)

انعام

ایک بے وقوف شخص نے امرود خریدا تو اُس میں سے کھرا نکلا۔

بے وقوف: ”یہ کیا، اس میں تو کھیرا ہے۔“

پھل فروش: ”یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے جناب، کیا معلوم اگلے امرود میں سے آپ کی موٹر سائیکل نکل آئے۔“

بے وقوف: ”کیا بات ہے! دو گلو امرود اور دے دو۔“

(عبدالباسط عباسی، گلگوٹھی)

پھانسی

جج: ”تمہارا جرم ثابت ہو چکا ہے، تمہیں پانچ سو پانچ بجے پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔“

مجرم: ”وہ تو ٹھیک ہے، مگر اتارا کب جائے گا، میں نے شام کو رکشہ بھی چلانا ہوتا ہے۔“
(عائشہ ذوالفقار، گوجرانوالہ)

بے وقوف

ایک آدمی نے کسی دیوار لٹکا ہوا پڑھا۔ ”لکھنے والا عقل مند پڑھنے والا بے وقوف ہے۔“

اس آدمی کو غصہ آ گیا۔ اُس نے فوراً اُسے مٹا دیا اور لکھ دیا۔

”لکھنے والا بے وقوف پڑھنے والا عقل مند ہے۔“

(عروج کائنات، جھنگ)

باتیں

ماسٹر (طالب علم): ”جب میں پڑھا رہا تھا تو تم کس سے باتیں کر

(بریلی) سے
کیا۔ ان کی
اسکول کی تعلیم کا
سفر ہمیں تک
ہے، مگر وہ خود کو
آج تک طالب
علم سمجھ کر علم کی
جستجو میں رہتے
ہیں۔

1951ء میں وہ
ہندوستان سے
ہجرت کر کے

سنہرے لوگ

غلام حسین بین



عبداللہ بیگ

جب ہم کسی بڑی اور غیر معمولی شخصیت کے بارے میں جاننا چاہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ دو یا تین شعبوں میں خاص صلاحیتوں کی مالک ہے اور اس شخصیت نے ان ہی شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار موثر انداز میں کر کے خود کو منوایا ہے، مگر جب ہم کسی ایسی شخصیت کو ڈھونڈنا چاہیں جو ہمہ جہت ہو تو یقیناً ہمیں مشکل ضرور پیش آئے گی۔

ایسی ہی ایک پیاری سی شخصیت عبداللہ بیگ کی ہے۔ وہ بہ یک وقت تاریخ دان بھی ہیں اور جغرافیہ دان بھی۔ اس کے علاوہ خطاط، صحافی، سیاح، شکاری، فلم ساز اور مدیر بھی ہیں۔ اس شخصیت کا چہرہ کسی بھی غرور اور تکبر سے مکمل خالی ہے۔ غرور تو انسان کے لیے ہلاکت کا سبب بنتا ہے، کیوں کہ ہمیں یہ سب صلاحیتیں اور کام کرنے کی طاقت تو اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں۔ ہمیں ان صلاحیتوں کا اظہار کر کے اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ یہی عادت ہمارے عبداللہ بیگ کی بھی ہے۔ وہ ہر دم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

عبداللہ بیگ 1936ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کا نام حبیب اللہ رکھا گیا، مگر ہم انہیں عبداللہ بیگ کے حوالے سے جانتے ہیں۔ بچپن میں عربی اور فارسی پڑھی۔ بعد میں حدیث کا کورس بھی کیا۔ ابتدائی تعلیم مسلم ہائی سکول اور میٹرک اسلامیہ کالج

پاکستان آ گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ رہائش کے لیے ایک چھوٹا سا کوارٹر ملا۔ عبداللہ بیگ کا سفر پاکستان میں انتہائی بے سرو سامانی میں ہوا۔ جھکیوں اور خیموں میں، بسر کیے ہوئے وہ دن آج تک نہیں بھولے، حالانکہ ان کے بڑوں نے دینی مدرسوں کے لیے اپنی حویلیاں تک وقف کر دی تھیں۔

یوں تو انہوں نے آٹھ نو سال کی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا، جب وہ متحدہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد جب حالات سازگار ہوئے تو انہوں نے پھر سے کاغذ اور قلم سنبھالا اور بچوں کے رسالے ”بھائی جان“ کے مستقل لکھاری بن گئے۔ شکاریات سے متاثر ہو کر ناول ”ہرنا سنگھ“ لکھا جو بعد میں کتابی شکل میں ”انسان زندہ ہے“ کے عنوان سے شائع بھی ہوا۔

اس کے بعد انہوں نے کچھ صحافت کا رخ کیا۔ روزنامہ امروز میں بحیثیت رپورٹر ملازمت کا آغاز کیا۔ بعد میں روزنامہ انجام میں چلے گئے۔ کسی ایک جگہ تک کر کام کرنا ان کی طبیعت کا خاصہ نہیں ہے۔ سیلابی طبیعت رکھنے والے اس صحافی کے اندر براڈ کاسٹر نے سر اُبھارا اور انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی کا رخ کیا۔ اُس دور میں ریڈیو کی دنیا ایک پُر اسرار دنیا تھی اور ہر شے کے انتہائی با صلاحیت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ یہاں موجود تھے۔

خاموشی

انہوں نے یہاں پر موجود شخصیات سے بہت کچھ سیکھا۔

ایک دفعہ ایک شہزادہ شکار کے لیے نکلا۔ وہ دن بھر شکار کے لیے ادھر ادھر مارا پھرتا رہا، لیکن اس کو کچھ نہ ملا۔ اچانک اُس کو ایک پرندے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے تیر چلا دیا جس سے پرندہ ہلاک ہو گیا۔ شہزادے نے کہا جب تک پرندہ خاموش تھا وہ محفوظ تھا اور جب بولا تو اپنی ہلاکت کا باعث بنا۔ اسی طرح جب باتوئی شخص بولتا ہے تو دوسرے کو بھی بولنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ بات دونوں کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔

(حسام بخار راجہ، راولپنڈی)

کے علاوہ رانی کوٹ، مہاتما بدھ، حضرت امیر خسرو کے 700 ویں عرس و سکھوں کے مقدس مقامات اور ترکی کے 50 سالہ جشن جمہوریت پر جانی جانے والی فلمیں بھی قابل ذکر ہیں۔

1992ء میں عبید اللہ بیگ ٹی وی سے استعفیٰ دے کر ماحولیات سے متعلق ایک ادارے میں چلے گئے جہاں ایک رسالے "NCS جریدہ" کے مدیر رہے اور کئی دستاویزی فلمیں بھی تیار کیں۔ چھ سال بعد اس ادارے کو بھی خیر باد کہہ دیا، مگر دستاویزی فلموں کا جنون ابھی تک ان پر سوار ہے۔ وہ معلومات سے بھرپور دستاویزی فلمیں اب بھی تیار کر رہے ہیں اور کئی موضوعات زیر غور ہیں۔ وہ ان دستاویزی فلموں کو ہی ذریعہ معاش اور ذریعہ اظہار سمجھتے ہیں۔

اپنے مشہور پروگرام کوٹنی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اگر اس پروگرام کو پھر سے پی ٹی وی یا کسی دوسرے چینل سے شروع کیا جائے تو یہ اب بھی مقبولیت حاصل کرے گا۔ اس پروگرام کے حوالے سے وہ اس واقعے کا اکثر ذکر کرتے ہیں کہ بلوچستان کے سردار اکبر کٹنی مرحوم، وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں جیل میں تھے۔ جب وہ باہر آئے تو انہوں نے عبید اللہ بیگ سے کہا: ”چھ ماہ جیل میں رہنے کے دوران میں صرف کوٹنی ہی کھیلتا تھا۔“ کوٹنی کے علاوہ انہوں نے ”بیانی کے ساتھ“ اور ”ہمت کے شاور“ پروگرام بھی کیے۔ چند انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی ان کی شناخت کا حوالہ ہیں۔

ریڈیو سے ایک بار پھر وہ صحافت کی طرف گئے۔ اس بار وہ روزنامہ حریت کے شعبہ ادارت میں شامل ہوئے اور کئی یادگار ادارے تحریر کیے جن میں ”موہن جواڑو کی آواز“ اور ”ایک روپے کی اینٹ“ آج بھی حوالے کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں۔ پہلے صحافت سے ریڈیو کا رخ کیا تھا۔ اب ان کا راستہ ٹی وی کی جانب تھا۔ یہاں انہیں، کوٹنی پیش کرنے کا حکم ملا۔ دراصل اسی طرز کا ایک پروگرام وہ ریڈیو پر بھی پیش کرتے رہے تھے۔ اب اسے ”کوٹنی“ کے نام سے ٹی وی پر شروع کیا۔ یہی پروگرام ان کی وجہ شہرت بھی بنا۔ اُس پروگرام نے ہر دور میں مقبولیت حاصل کی۔ اس پروگرام کا مقصد علم کا فروغ تھا۔ اس میں ہر بار ایک سے زائد شخصیات کو مدعو کر کے کہا جاتا تھا کہ وہ ماہرین عبید اللہ بیگ اور افتخار عارف کو زحمت دیں کہ آپ کی سوچی شخصیت، واقعہ یا جگہ کا نام بوجھیں۔ ایک کارڈ پر اس شخصیت، واقعہ یا جگہ کا نام لکھ کر عبید اللہ بیگ اور افتخار عارف سے چسپا کر حاضرین اور ٹی وی ناظرین کو پہلے دکھا دیا جاتا تھا اور پھر دونوں صاحبان کو کہا جاتا کہ وہ بوجھ کر دکھائیں۔ اب مقررہ تعداد میں سوالات کر کے عبید اللہ بیگ اور افتخار عارف اُس شخصیت تک پہنچ جاتے۔ اس طرح ناظرین کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوتا۔ بہت کم ایسا ہوا کہ وہ بوجھ نہ پائے ہوں۔ اس پروگرام کو ٹی وی پر شروع کرنے میں سید سلیم گیلانی اور اکمل اعظمی کی پُر خلوص کاوشیں شامل تھیں۔ شروع میں یہ ہفتہ وار پروگرام ساڑھے تین سال چلا۔ چھ ماہ بعد دوبارہ یہ پروگرام شروع ہوا اور پھر کئی سال تک پیش ہوتا رہا۔ اس پروگرام میں میزبانی کے فرائض قریش پور انجام دیتے تھے۔

عبید اللہ بیگ نے پاکستان کے ثقافتی ورثے کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے دل کش اور تاریخی جگہوں پر جا کر 40 دستاویزی فلمیں بنائیں جن میں 18 بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) کے مختلف مقامات کی ہیں۔ وہ 300 سے زائد دستاویزی فلمیں بنا چکے ہیں جو تمام کی تمام شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں پاکستان کی مختلف زبانوں، قبیلوں، تاریخی عمارتوں، پہاڑوں، جھیلوں، دریاؤں، ریگستانوں اور جنگلی حیات پر یادگار دستاویزی فلمیں شامل ہیں۔ اس

آئیے عہد کریں



نبیل اپنی بہن کو نرمی طرح پیٹ رہا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ اُس کی بہن ردا نے اُس کی ویڈیو گیم تھوڑی دیر کے لیے لے لی تھی۔ نبیل کو یہ بات بُری لگی تھی۔ اس طرح کی مار پیٹ اکثر گھروں میں ہوتی رہتی ہے، ممکن ہے ایسا آپ کے گھر میں بھی ہوتا ہو۔ آپس میں مار پیٹ کرنے کی بجائے بہن بھائیوں کو چاہیے کہ وہ گھر میں باہم محبت سے رہیں۔ آئیے عہد کریں آپ اپنے بہن بھائیوں سے باہم محبت سے رہیں گے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہد نامے میں شامل ہونے کے لیے کوہن ارسال کرنا ضروری ہے۔



ان بچوں نے عہد کیا کہ وہ جگہ جگہ نہیں تھوکیں گے۔

شباباش

قرآن العین، عائشہ مجید، طیبہ عظیم، عبداللہ طارق، خرم فاطمہ، محمد ابراہیم، حمزہ قاضی، سائرہ جاوید چوہدری، ردا عدیل، آفتاب عدیل، نعیم امین، لاہور۔ احمد رضا عبدالباق، کراچی۔ ندیم پردیسی، گوجرانوالہ۔ حافظ سلیمان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ علیزے منظور، راول پنڈی۔ یشرہ امین، سرگودھا۔ قمر ناز دہلوی، کراچی۔ نرہ شاہین، فیصلہ سلمان، سرگودھا۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ اسامہ طاہر، منڈی بہاؤ الدین۔ فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ شہزید سعید، نمل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ عائشہ رفیق، راول پنڈی۔ عمر فاروق، دینہ۔ عمران رمضان، الہ آباد۔ ابوذر، بنوں۔ راجہ قاضی، پنڈ دادخان۔ محمد معیز، کاموٹی۔ مومنہ حیدر، گوجرانوالہ۔ ایمان فاطمہ، راول پنڈی۔ تاثیر جمال، گوجرانوالہ۔ کوئل احمد، ملتان۔ سیباب آصف، سائی وال۔ حذیفہ انوار، جنگل صدر۔ نگین عامر، سیال کوٹ۔ عثمان علی حسنین، بمبائنہ۔ شہروز، فیصل آباد۔ رحسانیل، فیصل آباد۔ محمد حارث، بھٹہ، ملتان۔ انیس شہزاد، اسلام آباد۔ بریہ سلیم، لاہور۔ حسین ابن علی، عثمان ارشد، اسلام آباد۔ محمد اسامہ حنیف، روہینہ شاہین، کراچی۔ عائشہ ادریسی، علی پور۔ ارباب احسن، سوہا۔ محمد معید حیدر، راول پنڈی۔ مجاہد علی، پشاور۔ رفقا وقار، لاہور۔ عزیز اللہ، کراچی۔ ساجد علی عاجز، منڈی فیض آباد۔ محمد طارم نعیم، سائی وال۔ جنید نعیم دیوان، حویلی لکھا۔ مہک مشتاق، لاہور۔ علی رضا چاند، بھابڑہ۔ آمنہ واجد، ایبٹ آباد۔ محمد جاوید علی، ملتان۔ محمد زین طاہر، لاہور۔ احسن مصطفیٰ، سرگودھا۔ نعیم امین، لاہور۔

آئیے عہد کریں

کوہن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 مئی 2012ء ہے۔

نام _____ مقام _____

میں عہد کرتا کرتی ہوں کہ _____

اعصام الحق

کھیل اور کھلاڑی



نسرین شاہین



میں بہت مقبول ہو گیا۔ 1872ء میں دو برطانوی ڈاکٹروں نے ٹینس کا پہلا کلب قائم کیا۔ 1877ء میں ویملڈن کی پہلی چیمپئن شپ منعقد ہوئی۔ 1924ء میں آئی ٹی ایف نے باقاعدہ طور پر کھیل کے قوانین بنائے۔ یہ کھیل مٹی، کنکریٹ (ہارڈ) گھاس یا کارپٹ (ان ڈور) سے بنے میدانوں پر کھیلا جاتا ہے۔ ٹینس میں کھلاڑیوں کی استعداد، کارکردگی اور تعداد کے لحاظ سے کئی ٹورنامنٹ کھیلے جاتے ہیں۔ آسٹریلین اوپن، فرینچ اوپن، ویملڈن اور یو ایس اوپن سب سے اہم ٹورنامنٹ ہیں۔ دنیا میں چوٹی کے کھلاڑی ان میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد آئی ٹی وی ورلڈ ٹور ماسٹرز 100 کا نمبر آتا ہے۔ یہ دراصل نو ٹورنامنٹوں کا مجموعہ ہے۔ پھر آئی ٹی پی 250 سیریز اور 500 سیریز کے ٹورنامنٹ آتے ہیں۔ آخر میں چیمپئنز ٹور اور فیوچرز ٹورنامنٹس کا نمبر ہے۔ دنیائے ٹینس میں فیوچرز ٹورنامنٹس اہمیت کے اعتبار سے سب سے آخر میں ہیں۔ ان تمام ٹورنامنٹس میں انعام کی مالیت مختلف ہے۔ مثلاً فیوچرز میں فاتح کو 10 سے 15 ہزار ڈالر جب کہ چیمپئنز میں 25 سے ڈیڑھ لاکھ ڈالر تک ملتے ہیں۔ عام طور پر نو آموز کھلاڑی ابتدا کم درجے کے

پاکستانی ٹینس افسر اعصام الحق اپنے بھارتی جوڑی دار رہن بونہا کی سنگت میں 13 نومبر 2011ء میں پیرس ماسٹر ٹائٹل جیتنے میں کامیاب ہوئے۔ 2011ء کے دوران یہ ایشین جوڑی کی تیسری فتح تھی، اعصام الحق ان کے علاوہ آسٹریلین کھلاڑی اویور مارچ کی سا جھے داری میں بنکاک میں بھی ڈبلز فائنل جیت چکے ہیں۔ مجموعی طور پر اعصام الحق کے کیریئر کا یہ پانچواں اور بونہا کے ہمراہ چوتھا ڈبلز ٹائٹل ہے۔ فیصلہ کن معرکے میں اعصام الحق اور بونہا نے فرینچ جوڑی ٹولس مہٹ اور جولیئن بینیو کو اسٹریٹ سیٹ میں 6-2، 6-4 سے ٹھکانے لگایا۔ اس کامیابی پر ایشین پلیئرز ایک لاکھ 34 ہزار 500 یورو انعامی رقم کے حق دار قرار پائے۔ اعصام الحق اور بونہا 2011ء میں جرمنی کے شہر ہیل اور اسٹاک ہوم اوپن میں بھی ٹرافیوں اپنے نام کر چکے ہیں۔ جب کہ 2010ء میں جوبانسبرگ اوپن میں انہوں نے مشترکہ محنت کی بدولت پہلا ٹائٹل جیتا تھا۔

ٹینس دنیا کے چند مقبول کھیلوں میں سے ایک ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ٹینس نے ”ریٹکس“ اور ”پیلوٹا“ نامی دو کھیلوں کے ملاپ سے برطانیہ میں جنم لیا۔ جلد ہی یہ کھیل خصوصاً مغربی دنیا

کھلاڑی کی حیثیت تک پہنچ گئے تھے۔ آج تک کوئی پاکستانی کھلاڑی یہ پوزیشن حاصل نہیں کر پایا۔

اب بات کرتے ہیں دنیائے ٹینس کے افق پر روشن ہونے والے پاکستانی اسٹار اعصام الحق کی۔ اعصام الحق 7 مارچ 1980ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا خواجہ افتخار احمد تقسیم ہند سے قبل ہندوستان میں ٹینس کے قومی چیمپئن تھے۔ اعصام الحق کی والدہ نوشین احتشام خواتین کی قومی ٹینس چیمپئن رہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بچپن میں اعصام الحق کا پسندیدہ کھیل کرکٹ تھا۔ کرکٹ بھی دیکھ کر قدرتاً ان کے دل میں یہ کھیل کھیلنے کی خواہش پیدا ہوگئی، مگر ان کی والدہ انہیں دنیائے ٹینس میں لانا چاہتی تھیں۔ اعصام الحق کی عمر جب تیرہ سال ہوئی تو ان کی والدہ نے انہیں ایک ٹینس کلب میں داخلہ دلوا دیا اور پھر وہاں خود بھی کھیلنے لگیں۔ والدہ کی توجہ اور اپنی محنت کے باعث اعصام الحق جلد ٹینس کے اسرار و موز سے آگاہ ہونے لگا۔ ان کی صلاحیتیں دیکھتے ہوئے انہیں آئی ٹی ایف (انٹرنیشنل ٹینس فیڈریشن) نے دو سال تک اسپانسر کیا۔ اس انہونی نے اعصام الحق کی زندگی بدل ڈالی اور اب ٹینس کی دنیا کا وہ روشن ستارہ بن چکا ہے۔

اعصام الحق نے جونیئر ٹینس کی سطح پر کئی قومی و بین الاقوامی ٹورنامنٹوں میں حصہ لیا۔ انہیں کچھ میچوں میں شکست ہوئی تو کئی ایک میں جیت ان کا مقدر بنی۔ مسلسل محنت سے 1998ء میں اعصام الحق دنیائے جونیئر ٹینس میں ساتویں بہترین کھلاڑی بن گئے۔ اب تک ٹینس کے کسی پاکستانی کھلاڑی نے یہ سنگ میل نہیں چھوا تھا۔ 1998ء میں اعصام الحق پیشہ ور کھلاڑی بن گئے اور اسی سال انہوں نے ڈیوس کپ میں اپنا پہلا مقابلہ کھیلا اور تھائی کھلاڑی، دانائی ادوچو کے، کو شکست دی۔ پھر عمر خالق کے ساتھ ڈبلز مقابلہ بھی جیتا۔ 1999ء میں اعصام الحق کو پہلی اہم کامیابی ملی جب انہوں نے ویت نام میں ڈبلز فیوچرز ٹورنامنٹ جیتا۔ ان کا ساتھی مارک ٹیلز تھا۔ 2000ء میں اعصام الحق کی کوششوں سے پاکستان نے ڈیوس کپ کے ایشیاء گروپ 11 کے کوارٹر فائنل میں ہانگ کانگ کو شکست دی۔ اس سال اعصام الحق نے چیمپئن سرکٹ کے کئی عالمی ٹورنامنٹوں میں حصہ لیا۔ کئی ایک میں وہ سبی

ٹورنامنٹ کھیلے ہیں، پھر جیسے جیسے ان کا کھیل بہتر ہونے لگتا ہے وہ اعلیٰ درجے کے ٹورنامنٹ کھیلنے لگتے ہیں۔ ڈیوس کپ قومی ٹینس ٹیموں کے مابین کھیلا جاتا ہے۔ اس کا آغاز 1900ء میں ہوا تھا۔ ومبلڈن میں شریک ہونے والے پہلے پاکستانی ٹینس کھلاڑی خواجہ سعید حنی ہیں جو 1930ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ وہیں انہیں ٹینس کھیلنے کا شوق ہوا، پاکستان آئے تو تین بار قومی ٹینس چیمپئن بنے۔ ڈیوس کپ میں اپنے وطن کی نمائندگی کی۔ 1954ء سے 1956ء تک مسلسل تین برس انہوں نے ومبلڈن میں حصہ لیا۔ خواجہ سعید حنی کے ساتھ ایک انوکھا حادثہ بھی منسوب ہے۔ جب وہ ویسٹ آف انگلینڈ ٹینس چیمپئن شپ میں کھیل رہے تھے تو ایک چڑیا ان کی شاٹ کی زد میں آئی اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ٹینس کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور شاید آخری واقعہ ہے۔

1991ء میں فرنج اوپن کے دو سال پورے ہونے پر فرنج ٹینس فیڈریشن نے رولینڈ گاروس اسٹیڈیم میں ایک یادگاری دیوار تعمیر کرائی۔ اس دیوار میں چیمپئن شپ میں شرکت کرنے والے بڑے کھلاڑیوں کے نام ثبت کیے گئے۔ ان میں پاکستان کے خواجہ سعید حنی کا نام بھی جگہ رہا ہے۔ روزانہ کئی ہزار افراد اس دیوار کو دیکھتے ہوں گے۔ ایک اور پاکستانی کھلاڑی ہارون رحیم ٹینس کے ہیرو تھے۔ وہ یو ایس اوپن ڈبلز 1971ء کے کوارٹر فائنل میں پہنچنے والے واحد پاکستانی کھلاڑی ہیں۔ 1949ء میں لاہور میں پیدا ہونے والے ہارون رحیم نے صرف 15 برس کی عمر میں ڈیوس کپ کھیلنے والے کم عمر ترین پاکستانی کھلاڑی بنے۔ بعد ازاں کئی مقابلوں میں حصہ لیا۔ 1976ء میں ہارون رحیم نے امریکی شہر لٹل راک میں پہلا اے ٹی پی ٹائٹل جیتا۔ فائنل میں ومبلڈن کے رزراپ، روی کھلاڑی ایلکس میٹروپولی کو شکست دے کر سب کو حیران کیا، انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مشکل ترین (Closest) مقابلہ جیت رکھا ہے۔ یہ مقابلہ ہارون رحیم اور امریکی نام گرین کے مابین پٹی یو بیوا گراس چیمپئن شپ کے دوران کھیلا گیا۔ یہ مقابلہ ہارون رحیم نے 7-6، 5-1، 6-7 اور 5-4 سے جیتا۔ ہارون رحیم بین الاقوامی سطح پر 44 ویں بہترین

تھا۔ دونوں نے پہلا راؤنڈ تو پار کر لیا مگر دوسرے راؤنڈ میں 5 ویں بہترین جوڑے، وٹن بلیک اور کیون البت سے شکست کھا گئے۔ اسی سال ڈیوئس کپ میں حصہ لیا اور چینی کھلاڑیوں کو شکست دی۔ اس سال ڈیوئس ٹینس میں سنگلز میں اعصاب الحق کی رینٹنگ 265 تھی اور ڈبلز میں 102 تھی۔

2007ء میں جرمنی میں منعقدہ اے ٹی پی ٹورنامنٹ میں اعصاب الحق نے دنیا کے 11 ویں جب کہ فرانس کے نمبر 1

فائلٹل یا کوارٹر فائلٹل تک پہنچے۔ یوں اعصاب الحق کا کھیل کھرتا چلا گیا۔ جولائی 2000ء میں اعصاب الحق نے اطالوی کھلاڑی ڈیوئس برائیلی کے ساتھ برطانیہ میں ایل ٹی اے میگز چیمپئن ٹورنامنٹ میں حصہ لیا وہ دونوں فائلٹل جیتنے میں کامیاب رہے۔ یہ اعصاب الحق کا پہلا چیمپئن ڈبلز ٹائٹل تھا۔ اسی سال اعصاب الحق نے ایک اسرائیلی کھلاڑی کے ساتھ فرانس میں فیوچرز ڈبل ٹورنامنٹ جیتا۔ ازبکستان میں منعقدہ بخارا چیمپئنز میں وہ رنر اپ رہے۔ 2000ء ہی میں

اعصاب الحق نے ویت نام میں فیوچرز سنگل ٹائٹل جیتا۔ 2000ء میں اعصاب الحق ڈیوئس ٹینس کی سنگلز کینگری میں 261 ویں جب کہ ڈبلز کینگری میں 211 ویں بہترین کھلاڑی تھے۔

2002ء میں اعصاب الحق ڈیوئس ٹینس میں پاکستان کا نام روشن کرنے کا مزید سبب بنے۔ وہملڈن کے ڈبلز مقابلوں کے لیے ان کا ساتھی اسرائیلی کھلاڑی امیر واحد تھا۔ وہملڈن کے پہلے



راؤنڈ میں پاکستان اور اسرائیلی جوڑے کا ٹکراؤ مارٹن روڈرگیز اور نام وان ہوت سے ہوا۔ وہ یہ مقابلہ جیتنے میں کامیاب رہے۔ دوسرے راؤنڈ میں اس ٹوئیز جوڑے نے ڈبلز کینگری میں 11 ویں بہترین جوڑے ایلس فریرا اور رک لچ کو شکست دے کر پاپل چا دی۔ تاہم تیسرے راؤنڈ میں 7 ویں بہترین جوڑے اور چیک کھلاڑیوں، مارٹن ڈیم اور سیرل سک نے انہیں ہرا دیا۔ 2002ء ہی میں اعصاب الحق نے برطانیہ اور ہالینڈ میں لگاتار تین ڈبلز چیمپئن ٹائٹل جیت کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اور دوسرے گرینڈ سلام مقابلے میں یو ایس اوپن کے ڈبلز مقابلوں میں شرکت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس دفعہ بھی امیر حداد ہی اعصاب الحق کا ساتھی

کھلاڑی، رچرڈ گاسکٹ کو ہرا کر اپ سیٹ کر دیا تھا۔ یاد رہے گاسکٹ وہملڈن کے سیسی فائلٹل کھیل چکے تھے۔ اس شان دار جیت کے فوراً بعد اعصاب الحق کو وہملڈن کے سنگلز مقابلوں میں شرکت کا پروانہ مل گیا تھا۔ اعصاب الحق نے پہلے راؤنڈ میں لی چائلڈز کو شکست دی اور دوسرے راؤنڈ میں پہنچ گئے۔ یوں اعصاب الحق ہارون رحیم کے بعد دوسرے وہملڈن راؤنڈ میں پہنچنے والے دوسرے پاکستانی بن گئے۔ دوسرے راؤنڈ میں بڑے سخت مقابلے کے بعد اعصاب الحق آسٹریلیئن اوپن و یو ایس اوپن کے سابق چیمپئن مارت سفین سے ہار گئے۔ ڈیوئس ٹینس میں سنگلز میں اعصاب الحق کی بلند تر رینٹنگ 125 تک رہی جب کہ ڈبلز کینگری میں وہ دنیا کے 52 ویں بہترین کھلاڑی رہے ہیں۔

اعصاب الحق کو قومی ہیرو کی حیثیت حاصل ہے۔ انہیں نے جتنے ساز کار کردگی کا مظاہرہ کی اور جتنے اقوامی سطح پر خوب کھیلے۔ اعصاب الحق نے آنکھ کھولے ہی ٹینس کو کھیلنے والے بن گئے تھے۔ چیمپئن رہے تو والد بھی جس سال تک پاکستان ٹیمرن مسجد بنائی۔ اعصاب الحق ڈیوئس ٹینس کے حق کا ایک روشن پاکستانی ستارہ ہے۔

محققہ

(شہزاد احمد، لاہور)

انوکھی وصیت

(عبداللہ مہک، شب قدر)

انوکھا رپورٹ

(نمبرہ اقبال، کوئٹہ)

قانون

ایک شام قائد اعظم چہل قدمی کرتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس کے

توکل

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

روایت اپنی اپنی

بابائے اُردو مولوی عبدالحق اپنے چند عقیدت مند کے ساتھ ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے کہ ڈبلے میں بیٹھ ہوئے کسی مغرب زدہ شخص نے ان سے کہا: ”کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”جی ہاں پوچھ سکتے ہیں۔“ مولوی عبدالحق نے جواب دیا۔ اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور بات آتی لگتی ہو گئی۔ مولوی صاحب کے ایک عقیدت مند نے بعد میں ان سے دریافت کیا: ”مولوی صاحب! آخر آپ نے اپنا نام کیوں نہیں بتایا؟“

مولوی صاحب فرمانے لگے۔ ”گفت گو کا یہ کیا انداز ہوا؟ ہماری زبان میں اس طرح نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ آپ کا اسم شریف یا جناب کا نام کیا ہے، ان صاحب نے اپنی روایت کو سمجھے بغیر انگریزی کے اس

بارشوں میں جلدی بھوک کیوں لگتی ہے؟

بارش کے وقت درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے اس لیے انسانی جسم سے گرمی جلدی اور زیادہ خارج ہوتی ہے۔ گرمی کے اس اخراج کے نتیجے میں خوراک کے غذائی اجزاء کا استعمال بھی بڑھ جاتا ہے۔ بدن میں موجود غذا گرمی پیدا کر کے جلد ختم ہو جاتی ہے، اس لیے ہمیں بھوک محسوس ہوتی ہے۔

(عائشہ انعم، لاہور)

دانتوں کی نئی جین

جدید تحقیق کے مطابق مصنوعی دانت لگوانے کی بجائے اب بڑھاپے میں بھی نئے دانت اگائے جاسکتے ہیں۔ طبی ماہرین نے دانتوں کی نشوونما اور دانتوں کی پالش کو قائم رکھنے والے ایک جین کا پتہ چلایا ہے جس کو طبی سطح پر آئی ٹی پی ٹیو کا نام دیا گیا ہے۔ اس جین کی دریافت نے ڈنٹل سائنس میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ڈینٹلٹ نے توقع ظاہر کی ہے کہ اب مصنوعی دانت لگانے کے بجائے بڑھاپے میں بھی نئے دانت اگائے جاسکیں گے۔ اس کے علاوہ دانتوں کو کھڑا لگنے، سوراخ ہونے، پالش ختم ہونے اور دیگر امراض کا بھی کامیابی سے خاتمہ ہو سکے گا۔

(اقبال بیگ، مردان)

گدھے کا بچہ

ایک گدھا کسی مکان کے باہر کھڑا تھا۔ دوسرے گدھے نے

پوچھا:

”یہاں کیوں کھڑے ہو؟“

پہلا گدھا بولا: ”میرا بچہ گم ہو گیا ہے۔“

دوسرے گدھے نے کہا: ”تو پھر ڈھونڈو اُسے یہاں کیوں

کھڑے ہو؟“

دوسرے گدھے نے جواب دیا: ”اندر دو آدمی لڑ رہے ہیں اور ایک

دوسرے کو گدھے کا بچہ کچھ رہے ہیں، میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کہیں

اُن میں تو میرا بچہ نہیں ہے۔“ (سدرہ بتول، تلہ گنگ)

☆.....☆.....☆

عقبی گیٹ تک چلے گئے۔ ڈیوٹی پر موجود سنتری نے انہیں روکا اور کہا کہ رک جائے جناب، آپ آگے نہیں جاسکتے۔ قائد اعظم کے اسے ڈی سی ایڈمرل احسن پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ انہوں نے سنتری کو ڈانٹا اور کہا: ”کیا تم نہیں جانتے کہ یہ پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم ہیں؟“ سنتری بولا ”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کوئی شخص اس حد سے آگے نہ جائے۔ میں کسی کو یہاں سے آگے نہیں جانے دوں گا۔“ قائد نے اس کو شاباش دی اور فرمایا: ”مجھے تم پر فخر ہے۔ قانون سب کے لیے ایک جیسا ہی ہے۔“

(رابیل بلوچ، لاہور)

بڑا گناہ

حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ جن دنوں میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں پڑھنے پڑھانے کا فرض ادا کرتا تھا۔ ان دنوں میرا ایک ساتھی میرے حسن بیان اور نکتہ آفرینی کی وجہ سے مجھ سے حسد کرنے لگا تھا۔ جب مجھے علم ہوا تو میں اپنے استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور تمام حالات سے انہیں مطلع فرمایا کہ فلاں شخص میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ میری قابلیت اور کمال کے باعث مجھے پریشان کرنے پر کمر باندھ ہوئے ہیں۔

میرے استاد محترم نے جب میری باتیں سنیں تو اظہارِ ناراضگی فرماتے ہوئے کہنے لگے۔ مجھے اس بات کی حیرانگی ہے کہ ٹوٹنے اس کی زیادتی کا ذکر تو مجھ سے کر دیا ہے مگر یہ نہ سوچا کہ ٹوٹ بھی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کسی کی غیبت کرنا حسد کرنے سے بڑا گناہ ہے۔ اگر تیرے ساتھی نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا ہے تو خود تم بھی دوسرے دروازے سے وہیں جا رہے ہو، جہاں وہ پہنچا ہے۔

(محمد جعفر، گروٹ)

ہوا ہمیں نظر کیوں نہیں آتی؟

کوئی بھی چیز اُس وقت نظر آتی ہے۔ جب اس سے روشنی ٹکرا کر واپس آئے اور آنکھوں کے راستے دماغ کو اطلاع کرے، لیکن ہوا ایک ایسا مادہ ہے جس سے روشنی ٹکرا کر واپس نہیں آتی بلکہ اس میں سے پار ہو جاتی ہے اس لیے وہ ہمیں نظر نہیں آتی۔

میں ہی دیکھ رکھا تھا۔

تمہارے بچا کے ساتھ امجد اور تمہاری چچی بھی آ رہی ہیں۔
”واؤ پھر تو خوب مزہ آئے گا۔“ شانی بولا۔

☆☆☆

”دادا جان مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ شانی دادا جان کے کمرے میں آ کر کچھ جھجک کر بولا۔

”ہاں کہو بیٹے!“ دادا جان فوراً متوجہ ہوئے۔

”دادا جان! مجھے امجد سے شکایت ہے، وہ ہر وقت یوں رہتا ہے۔ ہر وقت اپنے دوستوں کے قصے سناتا رہتا ہے۔ میرے سر میں تو درد شروع ہو جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ اس کے خاموش ہونے پر دادا جان نے کہا۔
”دادا جان! مجھے تو حیرت ہوتی ہے وہ ہر وقت کیسے اتنا بول لیتا ہے، میں تو اس کی آمد پر خوش تھا کہ مجھے ایک دوست مل جائے گا مگر وہ تو بہت باتونی لڑکا ہے۔“ شانی نے کہا۔

”اچھا بیٹا، میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔“ دادا جان بولے۔

ابھی شانی کو گئے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ امجد کمرے میں داخل ہوا۔

”دادا جان! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ اس کے لہجے میں بھی شانی جیسی جھجک تھی۔
”ہاں بیٹا بولو۔“

”دادا جان! وہ شانی ہے نا، وہ..... مجھ سے بہت اکھڑا اکھڑا رہتا ہے، ڈھنگ سے بات بھی نہیں کرتا۔“ امجد رک رک کر بولا۔

”ہوں۔“ دادا جان نے کہا۔

”دادا جان! میں تو بہت خوش تھا کہ میں اپنے کزن سے دوستی کروں گا، ہم مل کر کھیلیں گے، پڑھیں گے، باتیں کریں گے مگر شانی کے چہرے پر تو ہر وقت بے زاری سی چھائی رہتی ہے، وہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ دادا جان بس میں پایا جان سے کہوں گا کہ ہم واپس چلے جائیں، میں یہاں مزید نہیں رہ سکتا۔“ امجد جذباتی ہو گیا۔



ظرف

(فرخ فاطمہ، حویلی کھٹا)

”شانسی بیٹا! کیا کر رہے ہو؟“ دادا جان نے کمرے میں جھانکنا۔
”کچھ خاص نہیں دادا جان، بس ہوم ورک کر رہا تھا جو مکمل ہو گیا ہے۔“



شانسی کتا میں ٹیبل پر ترتیب دے رہا تھا۔ ”اچھا، پھر ذرا جا کر اپنی امی کی بات سن لو، انہوں نے بازار سے سودا سلف منگوانا ہے، تمہارے صفت بچا آج شام کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔“ دادا جان کے لہجے میں پردہسی بیٹے کے آنے کی خوشی تھی۔

”جی دادا جان!“ شانی خوشی سے اچھل پڑا۔ شانی کی اپنے بچپا سے بہت دوستی تھی۔ وہ پندرہ سال قبل اپنی شادی کے فوراً بعد مع بیگم امریکہ چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا بیٹا امجد پیدا ہوا تھا جو شانی کا ہم عمر تھا، مگر شانی نے اپنے اس کزن کو صرف تصویروں

کی گنجائش دل میں نکل سکے۔

”شانی! مجھے معاف کر دو میں نے تمہارے بارے میں غلط سوچا۔“ پہل امجد نے کی۔

”نہیں امجد تم مجھے معاف کر دو، میں نے فضول تمہارے بارے میں غلط سوچا اور دادا جان سے تمہاری شکایت کر دی۔“ شانی ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

”تو کیا تم نے بھی؟“ امجد کے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”تو کیا تم نے بھی؟“ شانی اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر بولا۔

پھر دونوں ہنس پڑے اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئے جب کہ دادا جان محبت بھری نظروں سے اپنے پوتوں کو دیکھنے لگے۔
 (پہلا انعام: 200 روپے کی تپ)

پہچان

(حافظ حمزہ علی، عارف والا)

ساجد ایک دن سکول سے گھر آ رہا تھا کہ اُسے راستے میں ایک چھوٹا سا کتا دکھائی دیا جو کہ کمزور اور بھوکا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا لچ بکس کھول کر دیکھا اُس میں آدھی روٹی تھی۔ اُس نے وہ روٹی کتے کے سامنے پھینک دی اور خوشی خوشی گھر کی



طرف چلے گا۔

دوسرے دن اُس نے دیکھا کہ ایک آدھی گدھا گاڑی پر جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گدھے کو مار بھی رہا تھا۔ ساجد کو یہ بات بہت

”اچھا بیٹا، تم پریشان نہ ہو، میں دیکھتا ہوں اس معاملے کو۔“ دادا جی کے لہجے میں شفقت تھی۔

☆☆☆

”شانی بھائی، امجد بھائی، آپ دونوں کو دادا جان اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔“ اگلے دن کے کھانے سے فراغت کے بعد وہ یونی لافون میں بیٹھے اپنے اپنے مشاغل میں مگن تھے کہ گزیا نے آ کر کہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی دادا جان!“ دونوں دادا جان کے کمرے میں آ کر نظریں جھکائے کھڑے تھے۔
 ”بیٹھو بیٹا!“ دادا جان نے دونوں کو صوفے پر اپنے دائیں بائیں بٹھالیا۔

”آج میں تم دونوں کو اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب میں آٹھویں کلاس میں تھا، میرا ایک کزن کچھ عرصے کے لیے ہمارے گھر مہمان بن کر آیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے دوستی کرنا چاہتے تھے مگر کر نہ سکے۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میں خاموش طبع تھا، مجھے نہ زیادہ بولنا پسند تھا نہ زیادہ منہنا جب کہ میرے کزن کو اپنی سنانے اور دوسرے کی بات سننے کا بالکل شوق نہ تھا۔ وہ میری چپ رہنے کی عادت کو میری بیگانگی سمجھا اور میں اس کے زیادہ باتیں کرنے کی عادت کو فضول جان کر اس سے دور ہو گیا، بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا؟“ بات کے اختتام پر دادا جان نے دونوں سے پوچھا۔

”آپ دونوں کو ایک دوسرے کی عادت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔“ دونوں بیک وقت بولے۔
 ”تو بس میرے بچو، اب یہ کوشش تم دونوں کرو۔“ دادا جان دونوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ دونوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

”ہمیں زندگی میں کئی مرتبہ ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ہمیں اپنے مزاج سے ہٹ کر لوگ ملتے ہیں۔ ہم ان کی عادتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بلاوجہ ان سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اپنے اندر اتنا ظرف پیدا کرو کہ مختلف مزاج کے لوگوں

والا تھا، اُسے ایک آواز سنائی دی۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے ایک بابا جی کھڑے تھے۔ سلطان نے پوچھا: بابا جی! ”آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟“ بابا جی نے جواب دیا۔
”اے لڑکے! یہ تم کیا کرنے والے تھے، کیوں اپنے لیے جنت کا راستہ بند کرنا چاہتے ہو۔“

سلطان نے اپنی تمام داستان بابا جی کو سنا دی۔ بابا جی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا:

”دیکھو بیٹا! زندگی میں انسان کو کئی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ انسان ان چھوٹی چھوٹی ناکامیوں سے ناامید ہو کر خود کشی کا راستہ اپنالے، تم کچھ وقت انتظار کرو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ضرور کرے گا، اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ مایوسی گناہ ہے۔“



بابا جی کی باتوں سے مایوسی اُمید میں بدل گئی۔ وہ اگلے دن دوبارہ ملازمت کی تلاش میں نکل پڑا۔ آخر کار تیسرے دن وہ ملازمت کے حصول میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بابا جی کا شکریہ ادا کرنے اُن کے گھر گیا۔ پھر زندگی اچھے طریقے سے بسر کرنے لگا۔ وہ یہ بات جان چکا تھا کہ انسان کو کسی صورت بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ جس لمحے وہ اپنے رب کی رحمت سے مایوس ہو اُسی لمحے اُس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو جائے۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

بُری لگی کیوں کہ گدھا اُسے اُس کی منزل پر بھی پہنچا رہا تھا اور ساتھ ساتھ مار بھی کھا رہا ہے۔

اگلے دن ساجد اسکول سے نکلا تو وہی کتا جس کو اُس نے روٹی کھائی تھی اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کتے کو دیکھ کر ساجد کو حیرت ہوئی تھی۔

وہ گھر کی طرف چلنے لگا تو وہ کتا بھی اس کے ساتھ گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ گھر میں داخل ہو گیا تو کتا واپس چلا گیا۔ کھانا کھا کر وہ دادا جی کے کمرے میں چلا گیا۔ دادا جان کے پاس جا کر اُس نے کتے کو کھانا دینے اور آج کا واقعہ سنا دیا۔ دادا جان نے کہا کہ اس نے تم کو پہچان لیا کہ تم نے اس کو کھانا دیا تھا، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے حقیقی مالک کو نہیں پہچان رہے۔ تم نے اُسے صرف ایک بار کھانا دیا تھا۔ اُس نے ایک دن گزر جانے کے بعد بھی تم کو پہچان لیا اور ہم اللہ کو جو کہ ہمیں ہزاروں نعمتیں اور رزق دیتا ہے، اس کو نہیں پہچان پا رہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ ہم اس کی بندگی کریں تاکہ ہم فلاح پا سکیں اور جنت کے حق دار قرار پائیں، لیکن ہم ٹھیک طرح سے اس کی اطاعت بھی نہیں کر رہے اس کے باوجود وہ ہمیں پیٹ بھر کھانا دیتا ہے۔ ہمارے لیے یہ مقام باعثِ شرم ہے۔ ساجد پر اپنے دادا جان کی باتوں کا بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے مالک حقیقی کو ضرور پہچانے گا۔ اسی اثناء میں اذان کی آواز سنائی دی تو وہ فوراً مسجد کی طرف چل پڑا۔
(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

رحمت

(ربیعہ اکرام عزیز، لاہور)

سلطان ایک پڑھا لکھا ذہین نوجوان تھا۔ وہ روزانہ نوکری کی تلاش میں شہر جاتا اور ناکام واپس لوٹتا۔ آج اُسے ملازمت تلاش کرتے پورے چار ماہ بیت چکے تھے۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اب اُس کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ وہ کچھ سوچ کر ایک طرف چل پڑا۔ جیسے ہی وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا اور پہاڑ سے نیچے کودنے ہی

اعتبار ساجد

جیان کی بچائی



”پکا وعدہ“ جیان سے جان چھڑا کر کپڑے جھاڑتے ہوئے
نوبیتا نے کہا۔ ”کل اسی وقت اسی جگہ۔“ جیان ایک دم خوش بھی
ہو جاتا تھا۔ وہ دانت نکال کر بولا۔

”ٹھیک ہے دوست۔ کل اسی وقت اسی جگہ ہم ملیں گے اور تم
مجھے گچٹ دو گے۔ جس کی مدد سے میں دوستوں کو اڑ کر دکھاؤں گا
بہت مزا آئے گا۔“ پھر اس نے گھر کا رخ کرتے ہوئے گانا
گانے لگا۔

میں ہوں جیان

بڑا پہلوان

اڑ کر دکھاؤں گا

ڈور نہیں آسان

کیوں کہ میں ہوں جیان

میں ہوں جیان

نوبیتا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ اپنی گلی کی
طرف مڑ گیا تو نوبیتا بھی پلٹ کر اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

ڈورے مون گھر پر ہی تھا۔ امی بچن میں تھیں۔ نوبیتا کو دیکھ کر
ڈورے مون خوش ہو گیا۔ وہ نوبیتا سے بھائیوں کی طرح پیار کرتا

موٹے شرارتی جیان کو اس کی امی ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔
کبھی اس کمرے میں، کبھی اُس کمرے میں، کبھی برآمدے میں،
کبھی باغیچے میں۔

”جیان! جیان۔ کہاں ہو تم.....؟“

جیان وہاں ہوتا تو جواب دیتا۔ وہ تو اُدھر کرکٹ گراؤنڈ میں
ٹینک والے ڈبلے پتلے نوبیتا کی پٹائی کر رہا تھا۔ خوب دھول اڑ رہی
تھی۔ جیان کو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا تھا اور وہ بہانے بہانے
سے نوبیتا یا کسی اور کو روڑے کی پٹائی کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی
جیان غصے میں منہ سے جھلک چھوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”نوبیتا کے بچے! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ڈورے مون
سے اڑنے والا گچٹ مجھے لا کر دو گے مگر تم بہانے کرتے رہے،
اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمہاری چٹنی بنا دوں گا۔“

نوبیتا خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”جیان! جیان! مجھے چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل صبح اسی
جگہ میں تمہیں گچٹ لا کر دوں گا۔“

جیان نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

”پکا وعدہ کرتے ہو نوبیتا۔“

نظروں میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ مستقبل سے آیا ہوا بچہ تھا لہذا اس کی تمام باتیں کئی سالوں، کئی صدیوں آگے کی تھیں۔ دو منٹ میں اس نے دو گچٹ بنا لئے۔ ایک جیان کے لئے، دوسرا نو بیتا کے لئے۔ جیان اپنے گچٹ کی مدد سے اڑ سکتا تھا، مڑ سکتا تھا شیشین کا ایک ٹن دبا کر آہستہ آہستہ نیچے اتر سکتا تھا۔ بس اتنی تفریح ہی اس کے لئے کافی ہوتی، لیکن نو بیتا کے لئے ڈورے مون نے ایک مختلف گچٹ بنایا۔ یہ دراصل اس کے کنٹرول میں تھا کہ جیان کے گچٹ کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا تھا۔ وہ جیان کو پیچھے اڑنے پر بھی مجبور کر سکتا تھا اور تیزی سے آگے بڑھنے پر بھی۔ وہ اسے ہوا میں گول گول گھما بھی سکتا تھا اور ایک دم زمین پر اتار بھی سکتا تھا۔ ڈورے مون نے ساری باتیں نو بیتا کو بتا دیں۔

اس رات نو بیتا کو بڑی میٹھی نیند آئی۔ خواب میں وہ مونے جیان کو حیران و پریشان اڑتے دیکھتا رہا اور اپنے ریوٹ کنٹرول کو استعمال کر کے جیان کو خوب چکر دیتا رہا۔ وہ نیند میں بھی سوچ رہا تھا کہ جوڑے کے مونے تازے ہوں انہیں چاہئے کہ وہ کمزور اور دبیلے پتلے بچوں کی پٹائی نہ کریں۔ نو۔ نو۔ نو یہ غلط بات ہے۔ جیان اگر موٹا کدو ہے تو میرے پاس بھی ڈورے مون ہے جو میرے بھائیوں جیسا ہے۔ وہ جیان کو سبق سکھانے کے لئے پہلے بھی مجھے کئی گچٹ دے چکا ہے اور آئندہ بھی دے گا۔ نیا والا گچٹ تو کمال کی چیز ہے۔ یہ جیان کو ایسا سبق سکھائے گا کہ آئندہ وہ کسی کمزور یا دبیلے پتلے لڑکے سے شرارت نہیں کرے گا۔ جیان کے بچے! کل اسکول ٹائم کے بعد میدان میں پہنچ جانا میں بھی اپنے دوستوں کو لے کر پہنچ جاؤں گا۔ پھر ہم تمہیں ہوا میں بے وقوفوں کی طرح ہاتھ پیر مارتے دیکھیں گے اور خوب قہقہے لگائیں گے۔ میں تمہیں اپنے ریوٹ کنٹرول سے ایسی فلا بازیائیں کھلاؤں گا کہ یاد رکھو گئے بچو! عقل ٹھکانے آجائے گی۔

اگلے دن نو بیتا نے اسکول جا کر تمام دوستوں کو بتا دیا کہ وہ اسکول کے بعد لڑنے کے فوراً میدان میں پہنچ جائیں کیوں کہ وہ ہوا میں کچھ خاص کرتب دکھانا چاہتا ہے۔ چھٹی ہوتے ہی سب بچے گھروں کی طرف بھاگے تاکہ جلدی جلدی کھانا کھا کر فوراً میدان میں پہنچ سکیں۔ شیزو کا نو بیتا کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی وہ

تھا۔ اسے طرح طرح کے گچٹ بنا کر دیتا تھا۔ کیوں کہ ننھے رو بوٹ ڈورے مون کو سائنس پر عبور حاصل تھا۔ وہ نیوچر یعنی مستقبل سے آیا ہوا بچہ تھا۔ وہ نو بیتا کے گھر اس لیے اترتا تھا کہ اس کی اندرونی کمپیوٹر شیشین نے اسے بتا دیا تھا کہ زمین پر فلاں ملک کے فلاں شہر کی فلاں گلی میں ٹینک والا ایک پیارا سا بچہ ہے تم اس کے پاس رہو۔ اس کا کوئی بھائی بہن نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ ڈورے مون اس گھر میں مہمان بن کر آیا تھا، مگر نو بیتا کے امی ابو اتنے اچھے تھے کہ انہوں نے اسے اپنا مہمان نہیں بیٹا بنا لیا۔ ڈورے مون نے جب اپنی طاقت کے ذریعے بھاری بھاری چیزیں اٹھائیں۔ انہیں قریب سے لگایا۔ بانچے کو خوب صورت بنا دیا۔ اور خزاں کے سارے پتے ایک گچٹ کے ذریعے صاف کر دیئے تو نو بیتا کے امی ابو حیران رہ گئے۔ ڈورے مون بازار سے سبزی گوشت بھی لاتا تھا اس کے لئے اسے کسی سواری کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جب چاہتا سائیکل یا کار بنا کر بازار جاتا اور نو بیتا کی امی کی کبی ہوئی تمام چیزیں بالکل صحیح ریٹ پر لا کر دے دیتا۔ اس لئے سب اس سے خوش تھے۔ وہ سچ سچ اس گھر کا بڑا کارآمد فرد تھا۔

نو بیتا نے جب اسے اپنی پٹائی کا حال سنایا تو ڈورے مون چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

”نو بیتا! تم نے اس سے ایسا وعدہ کیوں کیا تھا؟“

”میں نے کب وعدہ کیا تھا“ نو بیتا نے کہا۔ ”وہ تو خود کئی دن سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ مجھے ایسا گچٹ لا کر دو جس سے میں لوگوں کو اڑا کر دکھا سکوں۔ اسے دوسروں پر رعب ڈالنے کا برا شوق ہے۔“

ڈورے مون بولا۔ ”اچھا جیان، میں تمہارا یہ شوق ایسا پورا کروں گا کہ تم یاد رکھو گے۔“ پھر وہ نو بیتا سے بولا۔ ”امی یکن میں کام کر رہی ہیں آؤ ہم ان کا ہاتھ بٹائیں۔ پھر کھانے کے بعد تم پڑھنا اور میں جیان کے لئے ایک گچٹ بناؤں گا۔“

کھانے کے بعد دونوں اپنے کمرے میں آئے۔ نو بیتا پڑھنے کے لیے بیٹھا تھا اور بار بار گردن گھما کر ڈورے مون کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، مگر ڈورے مون کی ایجاد کسی کی

منہ زمین کی طرف ہو گا مجھے کیا پتہ چلے گا کہ سرخ بٹن کون سا ہے، نیلا بٹن کون سا ہے۔ اور سبز بٹن کون سا ہے؟“

”تم تھوڑی دیر تک اسے غور سے دیکھو اور سمجھو“، نو بیتا نے کہا۔ پھر دوستوں کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ہاں دوستو! اب تم میدان میں دری بچھاؤ جس پر لکھا ہے ”Fly To Sky“ اب تھوڑی دیر بعد ہمارے پیارے جیان صاحب اس پر آکر لیٹیں گے۔ پھر ہم ان کی کمر پر گچٹ باندھ کر اسے اشارت کر دیں گے۔“

دوستوں نے فوراً میدان صاف کر کے دری بچھا دی۔ جیان سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور اونٹھے منہ دری پر لیٹ گیا۔

”گچٹ فٹ کیا جائے۔ ورنہ میرا موڈ خراب ہو گیا تو میں سب کے حلیے خراب کر دوں گا۔“

نو بیتا نے آگے بڑھ کر گچٹ کو اس کی کمر پر باندھا اور دو ڈوریاں نیچے لٹکا کر جیان کے ہاتھوں میں پکڑا دیں۔ ”تم دائیں ڈوری کو نیچے کھینچو گے تو نیچے آؤ گے۔ بائیں ڈوری کھینچو گے تو اوپر جاؤ گے۔ بس اب میں مشین اشارت کرنے والا ہوں۔“ سارے دوست پیچھے ہٹ گئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ نو بیتا نے گچٹ کا نیلا بٹن دبایا۔ پھر ررر کی آواز آئی اور جیان بچ بچ اوپر اٹھنے لگا، مگر اس کے چپکے ٹھوٹے ہوئے تھے۔ جوں جوں وہ اونچا ہوتا جا رہا تھا اس کی عوایاں اڑتی جا رہی تھیں۔ دوست تالیاں بجا رہے تھے۔ جیان اونچا ہو رہا تھا پہلے ایک منزلہ مکانوں کے اوپر پھر دو منزلہ، تین منزلہ، چار منزلہ جب وہ چھٹی منزل تک پہنچا تو وہاں بی ڈی کا ایک اٹھنا تھا۔ جیان اس اٹھنا سے لکرایا اور چیخیں مارنے لگا۔

”بچاؤ..... بچاؤ..... نو بیتا کے بچے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ مڑنے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔“ بکا یک اسے خیال آیا کہ دائیں ڈوری کھینچنے سے وہ آہستہ آہستہ نیچے آجائے گا۔ لہذا اس نے زور سے ڈوری کھینچی اُدھر نو بیتا نے اپنے ریہوٹ کنٹرول سے اسے اوپر دھکیل کر پھر اٹھنا سے لکرایا۔ وہ چیخیں مار کر باقاعدہ رونے لگا۔ اس کے آنسو بارش کے قطرہوں کی طرح برسنے لگے۔ نو بیتا ایک رحم دل لڑکا تھا وہ جیان کو تکلیف پہنچانا نہیں

کہنے لگی۔ ”نو بیتا! میں نے سنا ہے کہ کل پھر جیان نے تمہاری پٹائی کی تھی۔“

نو بیتا بولا: ”ہاں کل ایسا ہی ہوا تھا۔“
تھوڑی دیر بعد تمام دوست جلدی جلدی لٹچ سے فارغ ہو کر گھروں سے میدان کی طرف لپکے جہاں جیان اپنے جیسے نکلے لڑکوں کے ساتھ کھڑا بیٹھا رہا تھا اور ایک اُونچے چوڑے پر کھڑا ہو کر گامی رہا تھا۔

میں ہوں جیان

لوں گا اڈان

چھوٹوں کا آسمان

دیکھنا میری جان

جونہی نو بیتا، شیزوکا، دوڑے مون اور دوسرے دوستوں کو آتے دیکھ کر جیان دانت نکال کر چیختی ہوئی آواز میں بولا:

”میرے دوستو! تیار ہو جاؤ کچھ دیر بعد تمہارا کیوٹ اور بیڈٹم جیان ہوا میں اڑ رہا ہو گا۔“ نو بیتا کو دیکھ کر وہ بے تاب سے آگے بڑھ کر بولا۔

”لاؤ میرا گچٹ۔“

نو بیتا نے اسے ایک چھوٹی سے مشین دی جس میں رنگ برنگے بٹن اور ڈوریاں لگی ہوئی تھیں۔ ڈوریاں چوڑی تھیں جیسے اسکول بیک کی ہوتی ہیں۔

”اب جیسا میں کہتا ہوں ویسا کرو۔“ نو بیتا نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اونٹھے منہ زمین پر لیٹ جاؤ میں اس مشین کو تمہاری کمر پر فٹ کروں گا، مگر پہلے اس کو اڑانے کا طریقہ سمجھ لو۔ یہ جو نیلا بٹن ہے اسے دباؤ گے تو مشین اشارت ہو جائے گی اور تم آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگو گے۔ دائیں ڈوری کو نیچے کی طرف کھینچو گے تو آہستہ آہستہ نیچے آؤ گے۔ لال بٹن دباؤ گے تو اوپر جاؤ گے۔ سبز بٹن دباؤ گے تو رفتار کنٹرول ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے، سمجھ گئے، یاد بارہ سمجھاؤ۔“

جیان کچھ دیر تک مشین چلانے کے طریقے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر کھوپڑی سہلا کر بولا۔
”سمجھ تو گیا ہوں نو بیتا، مگر مشین تو میری کمر پر بندھی ہوگی۔“

انہوں نے آتے ہی اتنی زور کی سیٹی بجائے کہ سب گھبرا گئے۔ موموسائی بھی رک گیا۔ جیان کی جان میں جان آئی۔ چاچو کا جو لمبے دبیلے پتلے ڈرل ماسٹر تھے۔ جوانی میں یہ پہلوانوں کے ریفری ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی بات پر ایک پہلوان نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں ان کی کمر پکڑ کر پیٹنے کی اور پھر چھ فٹ اونچا اچھال کر رنگ سے باہر پھینکا وہ دن اور آج کا دن چاچو کا جویسے ناراض ہوئے کہ کبھی اُس طرف کا رخ نہیں کیا۔ سیدھے ایک اسکول میں پینچے اور وہاں ڈرل ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے، لیکن دل کے اتنے اچھے تھے کہ جہاں لڑائی ہوتے دیکھتے فوراً گلے میں لگی ہوئی سیٹی بجاتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے۔ یہاں بھی ان کی سیٹی نے کام دکھایا۔ لڑائی رک گئی۔

چاچو کا جو تقریباً تمام بچوں کو جانتے تھے۔ بچے ان سے ڈرتے بھی تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے پہلے تو موموسائی کو ڈانٹا کہ وہ گھر جا کر پڑھائی کرے۔ فضول لڑائی بھگڑا نہ کرتا پھرے ورنہ اس کے باپ سے شکایت کی جائے گی جو مار مار کر اس کا کچور نکال دیں گے۔ پھر وہ جیان کو دیکھنے لگے۔ وہ اُسے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

”جیان! تمہاری شکایتوں کی ایک لمبی چوڑی لسٹ میرے پاس ہے۔ اگر آئندہ تم نے کسی سے مار پٹائی کی تو میں تمہاری امی کو بتاؤں گا۔“ جیان امی کا نام سنتے ہی ہوش میں آگیا۔ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

”میری توبہ ہے سر! آئندہ میں کسی سے نہیں لڑوں گا، مگر اس وقت میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ پلیز مجھے چیری یا انناس کا جوس پلا دیں۔“

چاچو کا جو مسکرائے، مڑ کر بھیڑی طرف دیکھا۔ نو بیٹا جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔ ”سر! میں لاتا ہوں اس کے لئے انناس کا جوس۔“

یہ کہہ کر وہ ڈورے مون اور شیزو کا کے ساتھ جوس کارز کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے وہ جیان کی باتیں کر کے قہقہے لگاتے رہے، مگر واپسی پر اس کے لئے مزے دار جوس لے کر آئے۔

چاہتا تھا بس اسے تھوڑا سا سبق سکھانا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے اپنے ریوٹ کنٹرول سے جیان کو اس طرح چکر دینے شروع کیے کہ وہ ہر چکر پر ایک منزل نیچے آنے لگا۔ میدان میں جہاں دری چھٹی ہوئی تھی وہاں پہلوانوں کا لڑکا موموسائی بھی کھڑا تھا۔ یہ بھی شرارتی لڑکا تھا۔ نو بیٹا نے اپنے ریوٹ کنٹرول سے ایسا جھکا دیا کہ جیان قلابازیاں کھا کر دھڑام سے موموسائی کے اوپر آگرا۔ دونوں جھٹم جھٹما ہو کر دری پر گرے۔ جیان سیدھا کھڑا ہو کر پہلے تو گھومتی ہوئی زمین، آسمان، درخت اور عمارتوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے شیر کی طرح چنگھاڑتے ہوئے موموسائی کو دیکھا۔ موموسائی عمر میں جیان جتنا تھا، لیکن چونکہ پہلوانوں کا بیٹا تھا اس لیے جاپانی پہلوانوں کی طرح اس کی توند اس کے جسم سے آگے نکلی ہوئی تھی۔

موموسائی غصے میں کہہ رہا تھا۔ ”میرے پایا کا قول ہے کہ لڑائی میں پہل بھی مت کرو۔ ہاں اگر تم پر کوئی حملہ کر دے تو اسے چھوڑ دو۔“

جیان دانت پیس کر بولا۔ ”میرے پایا کا قول تو یہ ہے کہ لڑائی بھڑائی میں ہرگز پیچھے مت رہو، اس سے پہلے کہ کوئی تمہاری ناک پر منکا مارے تم آگے بڑھ کر پہلے ہی اس کی ناک کو ٹماڑ بنا دو۔“

گجٹ ابھی تک جیان کی کمر پر بندھا ہوا تھا۔ اس کی مٹھیں ابھی تک چل رہی تھیں۔ نو بیٹا کو شرارت سوجھی۔ اس نے اپنے ریوٹ کنٹرول سے ایک دم جیان کو اوپر اٹھا کر موموسائی پر گرا دیا۔ دوبارہ پھراٹھایا۔ پھر کی طرح ایک چکر دیا۔ اب کے جیان کی ٹانگیں موموسائی کے منہ پر پڑنے والی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ٹانگیں موموسائی کے چہرے سے کمراتیں موموسائی نے لپک کر مضبوطی سے جیان کی ٹانگیں جکڑ لیں۔ اسی وقت نو بیٹا نے ریوٹ کنٹرول سے کھیلنا بند کر دیا۔ جیان کا گجٹ بھی خاموش ہو گیا۔ اب موموسائی نے پہلوانوں کی طرح دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور جیان کو ایک مکا رسید کیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، تیسرے ٹکے پر جیان کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔

وہ تو بھلا ہو چاچو کا جو عین وقت پر میدان میں پہنچ گئے۔



مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

”آئیے عہد کریں“ کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اسے ختم نہ کیجئے گا۔

(حبیبہ جعفری، لاہور)

☆ آئیے عہد کریں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اپریل کا شمار بہت اچھا تھا۔ (عمران رمضان کبوتر، الہ آباد)

اپریل کا شمار ہاتھوں میں آیا تو خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بابو کباب والا،

اباجی کی الماری، چچا تیز گام نے پیٹ کیا، سنہرے لوگ اور صرف

تین گھنٹے اچھی تحریریں تھیں۔ (شہیر حسن، خوشاب)

اپریل کے شمارے میں تمام کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔

(فہد سلمان، سرگودھا)

اپریل کے شمارے میں بدلہ، بابو کباب والا، چچا تیز گام نے پیٹ

کیا زبردست کہانیاں تھیں۔ (اسامہ بن طاہر، منڈی بہاؤ الدین)

رنگ برنگے طوطے نظم خوب صورت تھی۔ تمام کہانیاں بہت اچھی

تھیں۔ تحریر یہ ہیں ہمارے اقبال پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔

(حمزہ افتخار، گوجرانوالہ)

تعلیم و تربیت کے ساتھ میرا تعلق دسمبر 2005ء سے ہے۔ اس کا

بر شمارہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ اس میں موجود تصاویر شمارے کو

مزید خوب صورت بنا دیتی ہیں۔ آپ سال میں ایک مرتبہ خاص

نمبر بھی شائع کیا کریں۔ (فرحان اشرف، بہاول نگر)

بدلہ، ادوار نانی اماں کہانیاں بہترین تھیں۔ ناول انوکھی دنیا بہت

اچھا ہے۔ (سعدیہ فضل کریم، راول پنڈی)

آپ کا رسالہ تعلیم و تربیت میں نے پہلی مرتبہ لیا۔ جو کہ اپریل

2012ء کا ہے۔ یہ رسالہ مجھے بہت پسند آیا۔ اباجی کی الماری،

کھٹو، مداوا، چچا تیز گام نے پیٹ کیا۔ نانی اماں بہت پسند آئیں۔

انوکھی دنیا بہت دل چسپ ناول ہے۔ (فتح محمد شارق، نوشہرہ)

اپریل کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ بدلہ، بابو کباب والا، مداوا بہت اچھی

کہانیاں تھیں۔ چچا تیز گام کا شمارے میں پا کر بہت خوش ہوئی۔

(نویہ الرحمن، انک)

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام تحریریں بہت عمدہ تھیں۔ کیا میں

کوئی حمد یا نعت بھیج سکتا ہوں؟ (اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

☆ آپ جو اور نعت بھیج سکتے ہیں۔

اپریل کا شمارہ ملا۔ سروق بہت پیارا تھا۔ کہانیوں میں بدلہ، مداوا،

صرف تین گھنٹے اور بابو کباب والا اچھی تھیں۔ کھٹو اور چچا تیز گام

کی کارستانیاں پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ اوجھل خاکے میرا پسندیدہ

سلسلہ ہے۔ آپ اسے جاری رکھیے گا۔

(سلمان ریاض، گوجرانوالہ)

اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ (شیخ محمد سعدی، ہری پور)

اس ماہ سروق بہت بہترین تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص طور

پر بابو کباب والا، مداوا، چچا تیز گام نے پیٹ کیا اپنی مثال آپ

تھیں۔ نظموں میں ایک پہاڑ اور گھبرائی اور رنگ برنگے طوطے

بہترین تھیں۔ (محمد جعفر، گروت)

اباجی کی الماری، مداوا اور نانی اماں پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ

گئے۔ ”انوکھی دنیا“ ایک دل چسپ ناول ہے۔ اس کی ہر ایک قط

کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ (ایمن احمد، راول پنڈی)

اپریل کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں بدلہ، بابو کباب والا،

مداوا، برکت، اباجی کی الماری بہت اچھی تھیں۔ معلوماتی تحریروں

میں اسکوائش، بچوں کا انسائیکلو پیڈیا، سید قاسم محمود، یہ ہیں ہمارے

اقبال اچھی تھیں۔ ڈرامہ نانی اماں ایک بہترین ڈرامہ تھا۔ ناول

”انوکھی دنیا“ بہت اچھا جا رہا ہے۔

(لیلیٰ جلیل الرحمن یوسف زئی، نوشہرہ)

اپریل کا شمارہ لا جواب تھا۔ سروق بھی خوب صورت تھا۔ اس میں

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ انوکھی دنیا ناول بہت اچھا ہے۔

(شمر بن قزوه، رحیم یار خان)

اپریل کا شمارہ بھی زبردست تھا۔ کہانیوں میں بدلہ، مداوا اور بابو

کباب والا نے دل جیت لیا۔ ناول انوکھی دنیا جیسے آگے بڑھ

خوش ہو گیا۔ انوکھی دنیا زبردست ناول ہے اور اس کی پانچویں قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ نظموں میں پاکستان ہے پاکستان اور ایک پہاڑ اور ایک گہری پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

(محمد عمر عطا قادری، کاموگی)
اپریل کے شمارے کے سروق پر رنگ برنگے طوطوں نے سروق کو چار چاند لگا دیئے۔ کہانیوں میں بدلہ، اباجی کی الماری اور مداوا دل میں اتر گئیں۔ (راجہ خاقان جنجوعہ، پنڈ داد خان)
اس ماہ کا سروق نہایت دیدہ زیب تھا۔ کہانیاں مداوا، ثانی اماس، برکت اور صرف تین گھنٹے بہت پسند آئیں۔

(آمنہ اہلس، فیصل آباد)
چچا تیز گام نے پیٹ کیا اور بابو کباب والا زبردست کہانیاں تھیں۔ (رجا سہیل، پشاور)
بدلہ، ایک پہاڑ اور گہری، نکھو، چچا تیز گام نے پیٹ کیا، برکت اور انوکھی دنیا بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ (محمد معین، کاموگی)
انوکھی دنیا کی ہر قسط بہت اچھی ہوتی ہے۔ (علی شہروز، فیصل آباد)
میری ایک تجویز ہے۔ آپ ہر مرتبہ کسی ہونہار طالب علم کا تعارف شائع کیا کریں۔ (ابراہیم دہرہ، لاہور)
☆ آپ کی تجویز پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
”آئیے عہد کریں“ سلسلہ بہت اچھا ہے اسے جاری رکھیے گا۔

(حفیدہ انوار، بھنگ صدر)
چچا تیز گام کی کہانی پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔
(عثمان علی حسنین، جموآند)
اپریل کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ کہانیاں بدلہ، بابو کباب والا، مداوا، چچا تیز گام نے پیٹ کیا اور صرف تین گھنٹے ٹاپ برتھیں۔ (اصیلہ عظیم، لاہور)
آداب قرآن مجید کو پڑھ کر قرآن مجید کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ بابو کباب والا، اباجی کی الماری، نکھو اور مداوا بہت عمدہ تحریریں تھیں۔ اوجھل خاکے اور آئیے عہد کریں میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔

(حمزہ علی، راول پنڈی)
اپریل کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ خصوصاً سروق تو بہت ہی خوب صورت تھا۔ (احمد رضا، کراچی)
کہانیوں میں چچا تیز گام نے پیٹ کیا اور صرف تین گھنٹے بہت اچھی تھیں۔ (عالیہ اقبال، پشاور)

رہا ہے۔ ہماری دل چسپی بھی بڑھ رہی ہے۔

(شمریز الرحمن، تحریم آرش، بہاول پور)
اداریہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ نے ادارے میں بہت اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے کیوں کہ وقت بہت قیمتی چیز ہے۔ علی اکمل تصور اور وقار حسن کی کہانیاں اچھی تھیں۔

(ماریہ جاوید چوہدری، لاہور)
اپریل کا شمارہ ملا ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ نظم ”رنگ برنگے طوطے“ بہت کمال کی تھی۔ (عبدالرحمن، جوہر آباد)
کیا میں تاریخی کہانیاں لکھ سکتا ہوں؟ (محمد ثاقب، بنوں)
☆ ضرور لکھئے۔

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ہر کہانی عمدہ تھی۔ (شیر بانو نسیم، لاہور)
اپریل کا شمارہ اپنی تمام تر دل چسپیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ سروق سے لے کر بلا عنوان تک ایک ایک سطر آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ (حسن رضا سردار، کاموگی)

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر بدلہ، بابو کباب والا، اباجی کی الماری، مداوا اور برکت بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ چچا تیز گام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ پچھلی مرتبہ کھون لگائے بہت مشکل تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ کوئی آسان کھون پوچھا کریں تاکہ جواب دینے میں آسانی ہو۔

(عائشہ مجید، لاہور)
اپریل کا شمارہ سپر ہٹ تھا۔ رنگین طوطوں سے سروق رنگین ہو گیا۔ ناول ”انوکھی دنیا“ اچھا جا رہا ہے۔ (ثناء جمال، اسلام آباد)
ناول انوکھی دنیا کمال ہے۔ (انعم عارف، لاہور)
اپریل کے شمارے کا سروق بہت پیارا لگا۔ کہانیوں میں بدلہ، نکھو، چچا تیز گام نے پیٹ کیا، برکت، صرف تین گھنٹے اور مداوا بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ (نمرہ شاہین، سرگودھا)
کہانی صرف تین گھنٹے بہت دل چسپ تھی۔

(عبداللطیف چاچڑ، کشمور)
ہر ماہ کی طرح اپریل کا شمارہ بھی بہت زبردست تھا۔

(عائشہ خنساء، جوہر آباد)
اپریل کا شمارہ رنگ برنگے طوطوں کے سروق کے ساتھ ملا۔ دل



ظفر حسنین

انوکھی ڈولی

”ڈولی! اب بتا بھی دو۔“ عمر بھی بے چین ہو گیا۔

اس سے قبل کہ ڈولی کچھ کہتی۔ شلیف سے منی اور سونی بھی اتر کر قائلین پر آ گئیں۔ چند لمحوں بعد تینوں کتابیں ہلنا شروع ہو گئیں۔ عمر اور عائشہ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ تینوں کتابیں آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔

”کچھ ہمیں بھی بتاؤ کہ تم آپس میں کیا باتیں کر رہی ہو۔“

عمر نے تینوں کو مخاطب کیا۔

”عمر بھائی! آپ کی حالت ڈولی کے بغیر ایسی ہو گئی تھی کہ نیم

بے ہوشی کی حالت میں آپ کی زبان پر ڈولی ہی کا نام تھا، میں تو

آپ کی ایسی حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ ڈولی کے آنے کے بعد تو

آپ تو یوں ٹھیک ہو گئے ہیں جیسے آپ پیاری نہ تھے۔ ایک آپ

ہیں اور ایک ڈولی ہے، یہ سونی اور منی سے باتیں بھی کر رہی ہے

اور آپ کو کچھ بتا بھی نہیں رہی، میرا دل کرتا ہے کہ اسے اٹھا کر باہر

پھینک دوں۔“ عائشہ بولتی چلی گئی۔

”تم نے ایسا کیا تو میں تمہاری پٹائی کروں گا۔“ عمر اپنی ڈولی

”میری پیاری ڈولی تم کہاں چلی گئی تھی۔ میں تمہارے بغیر بہت اداس ہو گیا ہوں، تم مجھے چھوڑ کر کیوں گئی تھی؟“ عمر نے ڈولی سے کہا۔

”عمر! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں۔“ امی جان کی بات سن کر عمر فوراً بولا۔

”میں اب ٹھیک ہوں، میری پیاری ڈولی آگئی ہے، مجھے اب کسی دو کی ضرورت نہیں۔“

”عمر! خدمت کرو، تم ٹھیک نہیں ہو۔“

”امی جان! آپ فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں، میں اپنی ڈولی سے باتیں کروں گا تو مزید ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”چلو ٹھیک ہے، عائشہ اپنے بھائی کا خیال رکھنا، میں ذرا کچن

کو دیکھ لوں۔“ یہ کہہ کر امی جان وہاں سے چلی گئیں۔ پھر عائشہ اور

عمر ڈولی کو لے کر قائلین پر بیٹھ گئے۔ ڈولی کی حالت بہت خراب

تھی۔ اس کے کئی صفحات پھٹ چکے تھے۔

”پیاری ڈولی! بتاؤ تم کہاں تھی؟“ عائشہ بولی۔

ہوا؟“ عائشہ نے سوال کیا۔

”میں چھلاگ لگا کر ایک جھاڑی میں چھپ گئی۔ میں کسی مناسب وقت پر اس جھاڑی سے نکلنا چاہتی تھی۔ باغ میں چند لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کی گیند جھاڑی میں گری تو گیند تلاش کرتے ہوئے ایک لڑکے کی نظر مجھ پر پڑی۔ اگلے ہی لمحے میں اُس کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے لڑکے گیند تلاش کر کے دوبارہ کھیل میں مصروف ہو گئے جب کہ وہ لڑکا مجھے لے کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ میرا ایک صفحہ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ اتنی تیزی سے صفحات پلٹ رہا تھا کہ میرے کئی صفحات پھٹ گئے۔ میں درد سے چلائی تو اُس نے گھبرا کر مجھے ایک طرف پھینک دیا۔ وہ مجھے کوئی جلی بھوت سمجھ رہا تھا۔ خوف کے مارے اُس کا چہرہ زرد تھا۔ وہ مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ اُس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میری طرف بڑھتا۔ میں نے جب اس بات کی تسلی کر لی کہ وہ مجھے پکڑ نہیں پائے گا میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوبارہ جھاڑی میں

کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

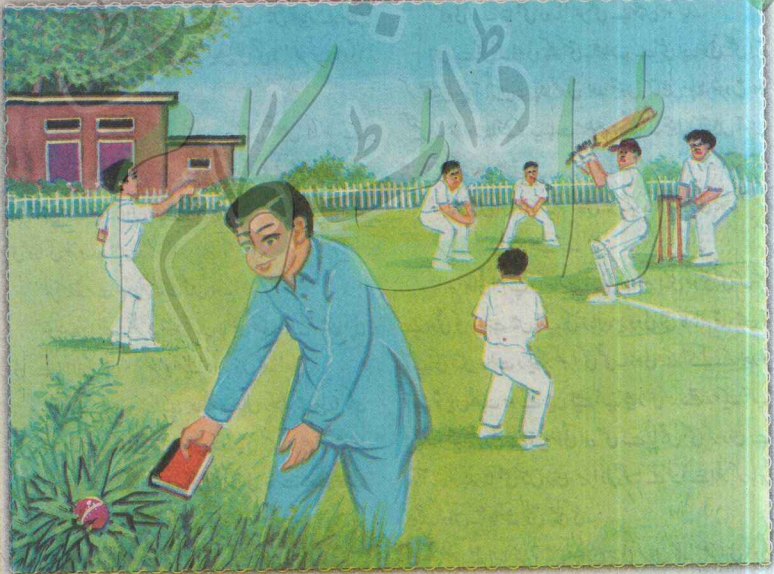
اس سے قبل کہ عائشہ عمر کی بات کا جواب دیتی اچانک ڈولی کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

”میں اپنے زندہ بچ جانے پر ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی ہوں، میں جب چند شریر لڑکوں کے ہاتھ لگی تو مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ بل بھر میں مجھے پڑھ پڑھ کر دیں گے۔ مگر ایک طرف سے ایک کتا بھونکنا ہوا آیا تو شریر لڑکوں کو اپنی پڑ گئی اور وہ مجھے باغ کے قریب پھینک کر ایک طرف بھاگ گئے۔“

”تم گھر سے باہر کیوں گئی تھی؟“ عمر نے پوچھا۔

”میں تو اکثر چپکے سے پتلی اور پکیلی کو ملنے چلی جاتی ہوں، میں جیسے جاتی تھی ویسے واپس بھی آ جاتی تھی، مگر اس مرتبہ میری جو حالت ہوئی ہے، اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، میں نے سوچا تھا کہ پتلی کو مل کر واپس آ جاؤں گی۔“

”جب شریر لڑکوں نے تمہیں باغ کے قریب پھینکا تو پھر کیا



”میں چھوڑ کر جانا ہوگا۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا، مجھے اس کتاب کی ضرورت ہے۔“

عمر بولا۔

”اگر ایسا ہے تو پھر پچاس روپے لوں گا اور ایک گھنٹے میں

کتاب کی حالت بدل کر رکھ دوں گا، بولو منظور ہے۔“ جلد ساز نے

خالص کاروباری انداز اپنایا۔

”مجھے منظور ہے۔“ عمر کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ جلد ساز

سارے کام چھوڑ کر ڈولی کی مرمت کرنے لگا۔ جلد ساز نے ڈولی

کی حالت کو یکسر بدل دیا۔ عمر بھی خوش تھا اور ڈولی بھی۔ عمر جب

ڈولی کو گھر لایا تو عانشہ بھی اُسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

”منی، سونی تم بھی میرے پاس آ جاؤ۔“ ڈولی کی آواز سن کر

دونوں فوراً شیلٹ سے نکل کر قالین پر آ گئیں۔ ڈولی جب عمر کو منتر

بتانے لگی تو منی نے اُسے ایسا کرنے سے منع کیا۔

”میں عمر سے وعدہ کر چکی ہوں، میں اپنے وعدے کا پاس

کروں گی۔“

عمر اور عانشہ ڈولی اور منی کی باتیں سن نہیں پا رہے تھے۔

”ڈولی اب مزید انتظار مت کراؤ، جلدی سے منتر بتا دو۔“

عمر منتر معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

”تو سنو وہ منتر کیا ہے۔“ ڈولی کی زبان سے یہ جملہ ادا

ہونے کی دیر تھی کہ عمر اور عانشہ کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”وہ منتر یہ ہے، بول بول بول، اپنے لب کھول، بول بول

بول، اپنے لب کھول یہ منتر پڑھ کر تم جس چیز پر پھونک مارو گے، تم

اُس کی آواز سن سکو گے، یہ منتر اُس وقت بے اثر ہو گا جب تم

جھوٹ بولو گے، چوری کرو گے، والدین یا اساتذہ کا کہنا نہیں مانو

گے۔“ ڈولی کے بتانے ہوئے منتر کو دونوں نے فوراً یاد کر لیا۔ پھر

عمر نے منتر پڑھ کر بیڈ کے پاس رکھے جوتوں پر پھونک ماری تو

جوتوں نے حرکت کرنا شروع کی۔ عمر اور عانشہ کی نظریں جوتوں پر

جمی تھیں۔ اچانک ایک جوتے کی آواز کمرے میں گونجی۔

(جوتے نے کیا کہا تھا، یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیے۔)

چھلانگ لگا دی۔ وہ لڑکا اب خوف کے مارے چلا رہا تھا۔ پھر وہ

بے ہوش ہو کر گر گیا۔ پھر میں جھاڑی سے نکل کر ایک درخت کی

اوٹ سے ہوتی ہوئی ٹینکی والی سڑک کی طرف بڑھی۔ اب اندھیرا

چھانے لگا تھا۔ میں بے خوف و خطر گھر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ

ایک کوٹھی کی بالکنی سے ایک بچی کی نظر مجھ پر پڑی۔“

ڈولی یہ کہتے ہوئے اچانک خاموش ہو گئی۔ کمرے میں کچھ دیر

تو سکوت طاری رہا پھر سونی نے پوچھا۔

”ڈولی! بتاؤ پھر کیا ہوا؟“

”وہ بچی سڑک پر چلتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے

مجھے دیکھ کر پکڑو پکڑو کا شور مچایا تو میں سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے

بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک گلی میں پانی کھڑا ہوا تھا میری جلد اُس پانی

کے باعث خراب ہوئی ہے۔ میں مسلسل بھاگتی ہوئی اپنی کالونی تک

پہنچی ہوں۔ میں زندہ بچ جانے پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر بھی شکر ادا

کروں وہ کم ہے۔“ ڈولی کی زبانی ساری بات جان کر عمر نے کہا۔

”ایک جلد ساز میرا واقف ہے میں کل تمہیں اُس کے پاس

لے جاؤں گا، تم پھر پہلے جیسی ہو جاؤ گی۔“

”اگر ایسا ہو گیا ہو تو.....“ ڈولی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”تو کیا؟“ عانشہ نے پوچھا۔

”تو میں تم دونوں کو وہ منتر بتاؤں گی جس کے پڑھنے سے تم

اپنے ارد گرد کی چیزوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سن سکو گے۔“

”کیا تم واقعی ہمیں منتر بتا دو گی؟“ عمر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ ڈولی بولی۔

اگلے دن عمر، ڈولی کو لے کر ایک جلد ساز کے پاس گیا۔ جلد

ساز نے ڈولی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

”اُس کی حالت تو خاصی خراب ہے مگر میں اس کی مرمت کر

دوں گا، تم اسے پرسوں آ کر لے جانا۔“

”میں اسے ابھی مرمت کروانا چاہتا ہوں۔“ عمر اپنی پیاری

ڈولی کو جلد ساز کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت تو اس کی مرمت کرنا ممکن نہیں ہے، تمہیں اسے



”ہاں..... ہاں مجھے معلوم ہے۔“
”بس یار جو کچھ جمع پونجی تھی وہ بچہ کے
علاج پر خرچ ہو گئی، اسی لیے میں نے
پچھلے ماہ رفاقت کے سٹور سے جو سودا
سلف ادھار لیا تھا اُس کے پیسے نہیں
دے پایا، میں تو بستی میں بے عزت
ہو گیا ہوں۔“ اقبال کی آنکھوں میں
آنسو آگئے تھے۔

”تم فکر کیوں کرتے ہو تیرا دوست
بے ناں، آؤ رفاقت کو اسی وقت پیسے
ادا کر کے تمہارا نام لسٹ سے کٹواتا
ہوں۔“
”تم دو گے پیسے؟“ اقبال نے حیرت
کا اظہار کیا۔ وہ جانتا تھا کہ قمر کی

آمدنی بہت تھوڑی سی ہے۔

”ہاں میں تمہارے پیسے دوں گا، میں میرے پاس پیسے، یہ
دیکھو میں مذاق نہیں کر رہا، استاد سے کچھ رقم ایڈوانس لی ہے، اب
یہ رقم رفاقت کو دوں گا۔“ قمر کی باتوں سے اقبال کی آنکھوں سے
آنسو بہنا بند ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ رفاقت کے سٹور میں
کھڑے تھے۔ پیسوں کی ادائیگی کے بعد رفاقت نے لسٹ سے
اقبال کا نام کاٹ دیا۔ جب وہ وہاں سے چلنے لگے تو رفاقت بولا۔
”میں ہوں بندہ بہت کھرا۔ میں سارا مہینہ بستی کے لوگوں کو
ادھار سودا سلف دیتا ہوں، پیسے مجھے بروقت ملیں یہ میرا حق بنتا
ہے، اقبال تمہارا نام لسٹ میں آیا ہے اس بات کو دل پر مت لینا
آئندہ ذرا احتیاط کرنا۔“

رفاقت کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اقبال کے
دماغ پر ہتھوڑا بن کر برس رہا تھا۔ دونوں اُسے ناخوش گوار انداز
میں گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

بستی بابا عنایت شہر سے دُور تھی۔ کافی عرصہ پہلے یہاں بابا
عنایت نے آکر بسیرا کیا تھا۔ یہ بستی اسی وجہ سے بستی بابا عنایت

اقبال جب دائیں گلی میں مڑا تو قمر گھرے پر بیٹھا اونگھ رہا
تھا۔ اقبال پر نظر پڑے ہی وہ ایک دم اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
اقبال کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کچھ ہی دیر میں رو دے
گا۔ قمر کچھ دیر تو اُس کو دیکھتا رہا پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگا۔
”کیا ہوا ہے؟“

”وہ..... وہ.....“ اتنا کہہ کر اقبال رونے لگا۔

”بناؤ کیا ہوا ہے؟“ قمر بولا۔

”وہ رفاقت نے مجھے بستی میں منہ دکھانے کے قابل نہیں
چھوڑا۔“

”کیا کیا ہے رفاقت نے؟“

”اُس نے اپنے سٹور پر ایک لسٹ آویزاں کی ہے، یہ لسٹ
ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس ماہ پیسے ادا نہیں کیے تھے، اس
لسٹ میں میرا بھی نام ہے۔“ اقبال نے تفصیل بتائی۔

”تم نے کتنے پیسے دینے ہیں؟“ قمر نے پوچھا۔

”دو ہزار تیس روپے، میں تو ہر ماہ باقاعدگی سے رفاقت کو
پیسے دیتا ہوں، اس ماہ پو پیڑھیوں سے گر گیا تھا۔“

”اس کا کھانا بتاتا ہے کہ اس ہوا سے کپے بہت زیادہ ہو گئے ہیں، میں اسی طرح ان لوگوں کو سودا سلف دیتا رہا تو کر چکا کاروبار، میں آدمی ہوں بہت کھرا، میں بہت حساب کتاب سے چلتا ہوں۔“ رب نواز رفاقت کی باتیں سنتا ہوا یوں سر ہلا رہا تھا جیسے اسے ہر بات سمجھ آ گئی ہو۔

☆.....☆.....☆

چاروں کے سامنے میز پر ایک نقشہ تھا۔ بلال نے ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔
”یہ ہے بستی بابا عنایت، یہ شہر سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔“
”اس کا مطلب ہے مجھے اس بستی میں جانا ہے۔“ مقبول بولا۔

”ہاں تم کل ہی اس بستی میں جاؤ گے، وہاں تمہارے رہنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔“ شہزاد کی بات سن کر مقبول نے کہا۔
”میں بستی بابا عنایت جانے کے لیے تیار ہوں۔“
”ویری گڈ، مجھے اُمید ہے تم ہمیشہ کی طرح کامیاب لوٹو گے اور وہاں کی پل پل کی خبر مجھے دو گے۔“ شہزاد نے مقبول کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
”میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“ مقبول بولا۔

اگلے دن مقبول بستی بابا عنایت کے ایک کوارٹر میں موجود تھا۔ بستی کے لوگ ایک دوسرے سے واقف تھے۔ جب بھی کوئی اجنبی بستی میں آتا تھا بستی والوں کو علم ہو جاتا تھا۔ مقبول کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ شام کے وقت اپنے کوارٹر سے نکلا تو برگد کے نیچے بیٹھے چند آدمی تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ جب وہاں پہنچا تو پہلوان جبار نے اپنی مونچھوں کو تازہ دیتے ہوئے پوچھا۔
”کیا نام ہے تمہارا؟“

”مقبول، مجھے مقبول کہتے ہیں۔“
”کہاں سے آئے ہو؟“ اشرف نے سوال کیا۔
”راحت نگر سے آیا ہوں۔“ مقبول نے جواب دیا۔
کچھ ہی دنوں میں مقبول کی بستی والوں سے جان بچکان ہو

کہلاتی تھی۔ اس کچی بستی میں بسنے والے لوگ بہت غریب تھے۔ یہاں رہنے والے لوگوں کی اکثریت محنت مزدوری کر کے اپنا گزارا کرتی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سرکاری اداروں میں ڈرائیور اور نائب قاصد تھے۔ شہر سے دور ہونے کے باعث یہاں ترقیاتی کام نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ لوگ زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم تھے۔ دس سال قبل شہر سے آ کر ایک شخص رفاقت نے یہاں ایک چھوٹا سا سٹور کھولا۔ چند ماہ ہی میں اس کا کاروبار چل نکلا۔ رفاقت نے لوگوں کو مائل کرنے کے لیے ادھار کا چال چھڑا دیا۔ اب تقریباً آدھی بستی کے لوگ اس سے ادھار سودا سلف لیتے تھے۔ ہر گھر میں ایک چھوٹی سی کاپی تھی۔ جب سٹور سے کوئی چیز لی جاتی اس کاپی پر اندراج کر دیا جاتا۔ بچے چپکے سے یہ کاپی اٹھا لاتے اور اپنی پسند کی کھانے کی چیزیں لے جاتے، یوں غیر ضروری چیزوں کی خریداری سے اچھی خاصی رقم بن جاتی تھی۔ رفاقت ادھار سودا سلف لینے والوں سے اشیاء کے دام بھی زیادہ وصول کرتا۔ ہر ماہ کے آغاز میں لوگ رفاقت کو پیسوں کی ادائیگی کرتے۔ رفاقت نے چند مہینوں سے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ جو لوگ بروقت پیسوں کی ادائیگی نہیں کرتے تھے وہ ان کے ناموں کی لسٹ دیوار پر آویزاں کر دیتا تھا۔ پہلے پہل تو رفاقت اکیلا ہی سٹور میں ہوتا تھا اب اُس نے ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ اتوار کو سٹور میں قدرے رش زیادہ ہوتا تھا۔ پچھلے اتوار کی بات ہے۔ نعمان نے دو کلو چاول مانگے تو رفاقت نے کہا۔
”چاول ختم ہو گئے ہیں۔“

”چاول کب تک آئیں گے؟“
”کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ چاول کب آئیں گے۔“ رفاقت نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ نعمان جب سٹور سے باہر گیا تو رفاقت کا ملازم رب نواز بولا۔
”استاد جی چاول ختم تو نہیں ہوئے۔“
”مجھے بھی پتہ ہے کہ چاول ختم نہیں ہوئے۔“
”پھر آپ نے اسے چاول دیئے کیوں نہیں؟“ رب نواز نے پوچھا۔

گیا جب اسی طرح اُس کی ماں بھی اس کی ملازمت کے لیے التجا لے کر کسی کے پاس گئی تھی۔ پھر ماضی کا یہ منظر دھندلا گیا۔ اسی اثنا میں مقبول کا موبائل فون بج اٹھا۔ سکرین پر شہزاد کا نام دکھائی دے رہا تھا۔ مقبول نے جب سبز بٹن دبا کر فون کان سے لگایا تو شہزاد کی آواز سنائی دی۔

”کام کا کیا ہوا ہے؟“

”کام جلد ہو جائے گا۔“

”ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، میرے اوپر بہت دباؤ ہے، اس مرتبہ رقم بھی زیادہ ملے گی، دیر مت لگاؤ، بس جلدی سے کام مکمل کر کے واپس آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے میں جلد واپس آ جاؤں گا۔“ مقبول نے یہ کہہ کر موبائل فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

اقبال، قمر، نعمان، اشرف، پہلوان جبار اور ارشد حجام مقبول کے کوارٹر میں موجود تھے۔ سب کے ہاتھوں میں وہ کاپیاں تھیں جن پر رفاقت جزل سنور سے ادھار لیے گئے سودا سلف کا حساب کتاب درج تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کاپیوں سے نجات حاصل کریں۔“

”ایسا کس طرح ممکن ہے؟“ پہلوان جبار نے مقبول کی بات بھی پوری نہ ہونے دی۔

”ایسا ممکن ہے، بس ایک مبینہ کی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔“

”آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔“ ارشد حجام بولا۔

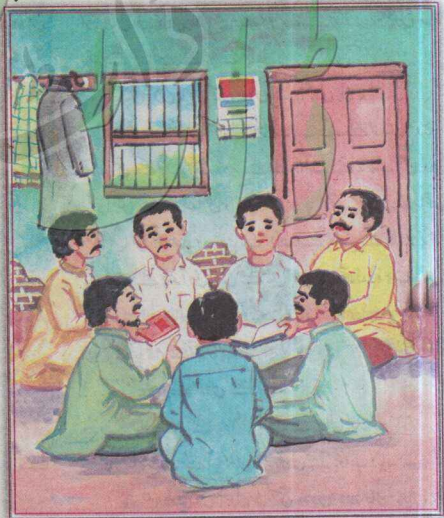
”بات یہ ہے کہ بستی کے جو لوگ رفاقت سے ادھار لیتے ہیں وہ اپنی تنخواہوں کا زیادہ تر حصہ ادھار لیے ہوئے سودا سلف کی مد میں ادا کر دیتے ہیں یوں اُن کو اگلے ماہ کے لیے دوبارہ سودا سلف ادھار لینا پڑتا ہے اگر ایک مہینہ ذرا سی تنگمی لیں تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ مقبول کی بات وہاں پر موجود تمام لوگوں کو

گئی۔ مقبول شام کے وقت برگد کے نیچے بھی کچھ دیر کے لیے چلا جاتا وہاں اُسے بستی کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوتا۔ سکول کے ساتھ ارشد حجام کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ارشد دل کا کھرا اور سچا آدمی تھا۔ بستی والوں کی حالت زار دیکھ کر مقبول کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ رفاقت کے بارے میں بھی اُس نے خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ شام کے وقت وہ شہزاد کو تمام دن کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا تھا۔ شہزاد ہر بار اُسے یہ کہتا کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ مقبول نے بستی کے ایسے نوجوانوں کی فہرست بنالی تھی جو بے روزگار تھے۔ ایک بے روزگار نوجوان کی ماں اُس کے پاس آئی تو اُس کے لبوں پر التجا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

”تم بھی میرے بیٹے جیسے ہو، میرے سہیل کو کہیں ملازمت دلوا دو، میں ساری زندگی تمہیں دُعائیں دوں گی، میں بہت آس لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔“

”میں کوشش کروں گا۔“ مقبول نے کہا۔

سہیل کی ماں تو وہاں سے چلی گئی، مگر مقبول کو وہ زمانہ یاد آ



نے بستی میں سے چار پانچ نوجوان تلاش تو کر لیے تھے، مگر سہیل کی ماں کی آنکھوں سے چمکنے والے آنسو اُس کے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے۔ وہ خود بھی بے روزگاری کے باعث جرم کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور ہوا تھا۔ بستی والے مقبول کے اس روپ سے واقف نہ تھے۔ وہ جہاں بھی جاتا سہیل کی ماں کی آنکھوں سے پہنے والے آنسو اس کا تعاقب کرتے۔ وہ کوارٹر سے باہر نکلتا تو بستی والوں کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار اور احترام دیکھتا اور جب وہ کوارٹر میں واپس جاتا تو اپنی ہی نظروں سے گر جاتا۔ وہ عجیب شش مکش میں مبتلا تھا۔ اُس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ کس راستے کا انتخاب کرے۔ آخر ایک رات اُس نے شہزاد، یاسر اور بلال کو اپنے کوارٹر میں بلایا کہ وہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ مقبول اُس رات بہت مطمئن تھا۔

”مقبول کہاں ہیں وہ نوجوان، انہیں بلاؤ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“ شہزاد جلدی میں تھا۔ مقبول نے موبائل فون سے ایک نمبر ڈائل کیا اور کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ اس کے ایسا کرنے کی دیر تھی کہ کچھ ہی دیر میں پولیس کوارٹر میں موجود تھی۔ خوف اور گھبراہٹ کے باعث شہزاد، یاسر اور بلال کے چہروں کی رنگت زرد تھی جب کہ مقبول کا چہرہ پُر سکون تھا۔ بستی والوں کو مقبول کا یہ روپ دکھائی دیا تو کوئی یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مقبول جب پولیس وین میں بیٹھنے لگا تو بستی والے وہاں موجود تھے۔ مقبول نے انہیں دیکھ کر کہا۔

”میرا اصلی روپ یہی ہے، میں اپنے جرائم کی سزا کاٹ کر آؤں گا تو اُس مقبول کے روپ میں آؤں گا جسے آپ لوگ پیار کرتے ہیں، جس کا احترام کرتے ہیں۔“ مقبول نے پولیس وین میں بیٹھتے ہوئے دیکھا کہ وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُسی لمحے وہ آنسو بھی اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے جو بے روزگار سہیل کی ماں کی آنکھوں سے ٹپکے تھے یہی آنسو اُسے جرم کی دلدل سے نکال لائے تھے۔

☆.....☆.....☆

کچھ آگئی تھی۔ رفاقت کو بھی اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ شام کے وقت وہ اپنے ساتھ دھمکی کو لیے مقبول کے کوارٹر میں موجود تھا۔ مقبول کو بستی والوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس لیے وہ رفاقت کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ بستی والوں نے ایک ماہ تنگی ترشی میں گزارا۔ یوں وہ ادھار سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مقبول اس کامیابی پر بہت خوش تھا۔ وہ جب بھی اپنے کوارٹر میں آتا اُسے سہیل کی ماں کے آنسو اپنی آنکھوں کے سامنے گردش کرتے دکھائی دیتے۔ وہ کئی بار ان آنسوؤں کو دیکھ چکا تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا تھا یہ آنسو اُس مقصد کے حصول میں حائل ہو گئے تھے۔ شہزاد کا بار بار فون آ رہا تھا۔ مقبول ہر بار ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ مقبول کی نظر اب بستی کے اکلوتے سکول پر تھی۔ اس سکول پر ایک اثر و رسوخ والے شخص ریحان نے قبضہ جما رکھا تھا۔ مقبول کو اس معاملے میں بستی والوں نے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ پولیس کو اس معاملے میں شامل کرنے کے باعث مقبول یہ مسئلہ حل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ بستی کی ڈپنری کی حالت بھی ختم حال تھی، مقبول نے کچھ خیر حضرات کی مدد سے ڈپنری کی حالت کو بہتر کیا۔ اب بستی کے ہر شخص کے لبوں پر مقبول کے لیے دُکھائیں ہی دُکھائیں تھیں۔ وہ جہاں سے بھی گزرتا لوگ اُس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ شہزاد بھی مقبول کے بارے میں بے خبر نہیں تھا۔ اُسے مقبول پر شدید غصہ تھا۔ ایک دن شہزاد نے فون کر کے اُسے کہا کہ وہ لیڈر بننے کی بجائے وہ کام کرے جس کے لیے اُسے یہاں بھیجا گیا ہے۔ مقبول نے یہ بات سن کر کہا۔

”لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایسا تو کرنا پڑتا ہے۔“

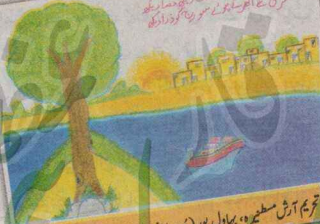
”تم نے پہلے تو کبھی اتنا وقت نہیں لگایا، بستی کے چار پانچ نوجوان لے آؤ اور مال کھا کرو۔“ شہزاد نے اُسے سمجھایا۔

مقبول اس بستی میں اس لیے آیا تھا کہ وہ ایسے نوجوانوں کو تلاش کر سکے جو بے روزگار ہوں اور انہیں ملازمت کا جھانسنے کے ردِ دہشت گردی جیسے مکروہ فعل میں دھکیل دیا جائے۔ اُس

ہونہار مصور

طلوع آفتاب کا منظر

سکول آگے میں ایک ملک دیکھنا ہے کہ
مشرق سے آج کی سورج کو دکھانا ہے



تحریم آرش مطہر، بہاول پور (دوسرا انعام 150 روپے کی کتب)



فرخندہ نواز، پشاور (پہلا انعام 175 روپے کی کتب)



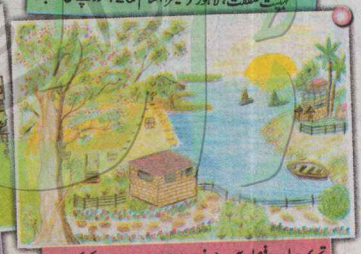
حنیفہ جعفری، لاہور (چوتھا انعام 100 روپے کی کتب)



تنہا شفیقت، لاہور (تیسرا انعام 125 روپے کی کتب)



محمد سعید، فیصل آباد (چھٹا انعام 75 روپے کی کتب)



تحریم اویس، فیصل آباد (پانچواں انعام 90 روپے کی کتب)

کچھ اعلیٰ معیار کے نام پر دیئے گئے ہیں: شام، جمال، اسلام آباد، میری باہر، سیال کوٹ، مقدس اسلم، بھولال۔ ماہ نور مالک گورانی، گوجرانوالہ۔ سیف اللہ، ذریہ اسماعیل خان۔ ستالی زبان، پشاور۔ محمد حسن فاروق، صفی اللہ سعید، لاہور۔ قاسم علی شریح، شاہ کوٹ۔ محمد مرسل حسین، ساہی وال۔ محمد عزیز احمد قادری، کاموکی۔ اسد اختر، صادق آباد۔ فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ چوہدری محمد حفیظ، گجر، سرگودھا۔ نزل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ اقصی شہزادی، بھارت۔ اقصی رحمان، بمبئی۔ مریم، لاہور۔ رحمان سعید، سرگودھا۔ قلم دیدار سنگھ، حنیفہ ندیم، گوجرانوالہ۔ محمد علی حفیظ، گوجرانوالہ۔ شہزادہ سعید، ملتان۔ منیرہ قدوس، دادہ ٹیکٹ۔ رونا نوید، لاہور۔ فائزہ ثناء، ملتان۔ سید محمد عادل ہاشمی، لاہور۔ ارشد فاروق، میاں والی۔ محمد حسن رضا، جوہر آباد۔ سید محمد سعید، ہری پور۔ طہیر رحیم، میاں والی۔ عمیر احسن، راولپنڈی۔ حاشیہ شیخ، راولپنڈی۔ رونا عدیل، لاہور۔ سید عبدالملک شاہ، بہاول پور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور تین ہونے تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پینل یا بیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جون کا مہینہ	جولائی کا مہینہ
غور سے دیکھو	میسرے پرست
آخری تاریخ 8 مئی	آخری تاریخ 8 جون

بلا عنوان



اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان
بیچنے کی آخری تاریخ 10 مئی 2012ء ہے۔



اپریل 2012ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں
سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی
500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔



- ▶ اسے کہتے ہیں دماغ لڑاؤ، وقت بچاؤ۔ (مدر کرم شہزاد، سرگودھا)
- ▶ نہ چھری سے نہ ہتھیار سے، ڈبل روٹی کٹے گی تلوار سے۔ (محمد حسنین ریاض، انک)
- ▶ یوں پکایا جاتا ہے کھانا تلواروں کے سائے میں۔ (احمد جمال ترازوی، لاہور)
- ▶ آج ڈبل روٹی کی خیر نہیں۔ (راجہ ثاقب محمود، پٹنہ ودان محنت)
- ▶ اب تلواروں کا صرف یہی استعمال رہ گیا ہے۔ (حسین ابن علی، اسلام آباد)